جولائی ۲۰۲۵ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

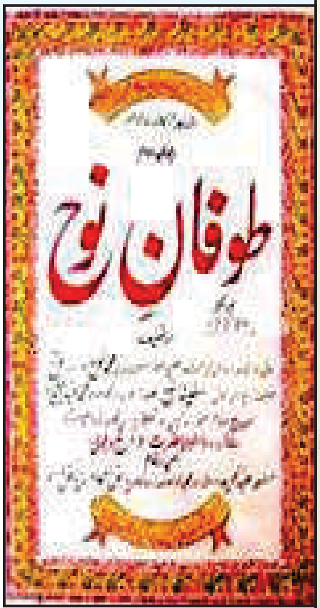

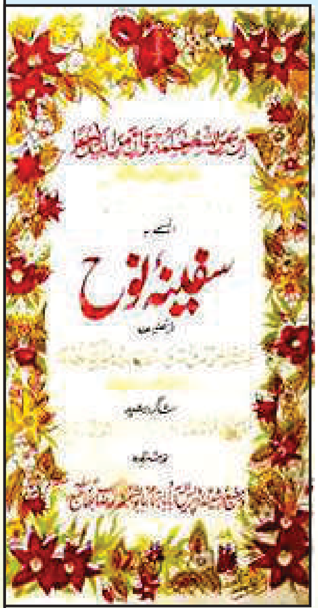

اسرآر جامعی

اسرآر جامعی کا اصل نام اسرارالحق تھا،لیکن جہان سخن میں وہ اپنے قلمی نام ''اسرآر جامعی'' سے ہی جانے جاتے ہیں۔ ان کے والد سید ولی الحق اپنے وقت کے رؤسا اور خلافت تحریک کے سرگرم رہنماؤں میں تھے اور ان کے دادفضل حق آزادؔ عظیم آبادی کا نام بھی تعارف کا دست نگر نہیں۔ اسرآر جامعی کی ولادت اپنی نانیہال نظام پور ضلع گیا میں ۲۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو ہوئی اور ۴/اپریل ۲۰۲۰ء کو انہوں نے دہلی میں وفات پایا اور وہیں مدفون ہوئے۔ اسرآر جامعی نے جامعہ ملیہ دہلی کے مدرسہ میں پڑھا تھا، اسی مناسبت سے وہ اپنے تخلص کے ساتھ ''جامعی'' لکھتے تھے۔ جامعہ کی تعلیم کے بعد اسرآر نے رانچی یونیورسٹی سے گریجویشن کی سند لی تھی۔ اسرآر جامعی بنیادی طور پر طنز و مزاح کے شاعر تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''شاعر اعظم'' اکتوبر ۱۹۹۶ء میں چھپا تھا اس کے بعد ''طنز پارے'' کی اشاعت ہوئی جو ان کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ اسرآر جامعی طنزیہ و مزاحیہ صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں پٹنہ سے انہوں نے اخبار ''چٹنی'' نکالا تھا اور پھر دہلی سے ''پوسٹ مارٹم'' کا بھی را کیا۔ مزاحیہ ادبی معرکہ آرائی اور پیروڈی نگاری میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔

گفتۂ اسرآر

ہمارے قصر شوکت کا بس اتنا نام باقی ہے
کہ اس میں اک دریچہ اور شکستہ بام باقی ہے
ہماری عظمت کردار چوراہوں پہ بکتی ہے
کتابوں میں بزرگوں کا فقط اب نام باقی ہے
متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
برائے نام ان کے دل میں اب اسلام باقی ہے

(باقی نامہ)

یہ مظلوم کتے مگر با صفا ہیں
وفا میں یہ انسان سے بھی سوا ہیں
یہ ممکن نہیں ، کوئی کتا بھلا دے
جو کوئی اسے ایک لقمہ کھلا دے
یہ غیروں کی تو ہڈیاں تک چباتے
مگر گوشت کتے کا کتے نہ کھاتے

(کتے)

طنز سے کہتا ہے ہر شخص چری مار ہو تم
اپنی سسرال کے دربان طرح دار ہو تم
پھبتی کستا ہے کوئی ، مرغ گرفتار ہو تم
کوئی کہتا ہے کہ بیگم کے نمک خوار ہو تم
رشک ہے قسمت داماد پہ دیوانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

(خانہ داماد)

BIHAR URDU ACADEMY

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۶ شمارہ : ۷

جولائی ۲۰۲۵ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابرار احمد خان	۳
مقالات	صبؔا نقوی کا حمدیہ و نعتیہ کلام: ایک مطالعہ	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	۴
	سلور کنگ کچھ تکنیکی خامیوں کے ساتھ	ڈاکٹر نظیر حسین خاں	۷
	ڈاکٹر قمر جہاں: حرف آگہی کے آئینے میں	ڈاکٹر یاسمین اختر	۱۵
	اردو ادب میں ہندوستانی علم واساطیر کا سحر	ڈاکٹر ندیم احمد	۱۹
	نوؔح ناروی اور ان کی شاعری	نجم الزماں	۲۲
ابنِ صفی	ابن صفی اور اُن کے جاسوسی ناول	درخشاں جبیں	۲۶
	قطعاتِ تاریخ وفات ابن صفی	منیر سیفی	۳۴
	ایک یادگار مشاعرہ	طغرل فرغان	۳۶
افسانے	احساس کے ویرانے میں	عشرت ظہیر	۴۰
	کھوئی ہوئی شناخت	ڈاکٹر محمد نہال افروز	۴۲
انشائیہ	آؤ! چائے پیو	ایس معشوق احمد	۴۷
گاهے گاهے......	کہانیوں کی کہانی	سہیل عظیم آبادی	۴۹
	گرگٹ کے خطوط	وہاب اشرفی	۵۳
منظومات	صبا کو ایک مشورہ / آئینہ	علیم اللہ حالؔی / علی شاہد دلکشؔ	۵۷
	غزلیں	مدہؔوش بلگرامی / سیفؔی سرونجی	۵۸
	غزلیں	مصداؔق اعظمی	۵۹
	غزلیں	عمراؔن عظیم / سرؔور نگینوی	۶۰
	غزلیں	مشتاؔق سیوانی	۶۱
	غزل	سید عماؔن حسین	۶۲
کتابوں کی دنیا	ہمارے تبصرے — ڈاکٹر محمد مظاہر الحق	مبصر: پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم	۶۳
	چھوٹی سی گڑیا...... — ڈاکٹر بانو سرتاج	مبصر: محمد غفران	۶۶
سلام و پیام	ڈاکٹر عطؔا عابدی، عبدالرزاق پیکر رضوؔی، یاسمین پروین، سروری بانو، ڈاکٹر قیصر زاہدی		۶۹

بچوں کا زبان وادب

۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب''میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ۔

اداریہ

حرفِ آغاز

سپاسِ فراواں مالک لوح وقلم کا ـــــ مجلّہ ''زبان وادب'' کی تازہ اشاعت حاضر ہے۔اس کے مشمولات کا مقالاتی آغاز اُس وقیع تحریر سے ہورہا ہے جس میں قرآنی حوالوں کے ساتھ صبا نقوی کے حمدیہ ونعتیہ کلام کے فکری وشعری محاسن کی طرف برجستہ ولطیف اشارے گئے ہیں اور حسن اتفاق کہ اس حصہ کا اختتام بھی اُس مقالہ پر ہوا ہے جس میں سوانحی کوائف اور ادبی تاریخ کے ضروری منظروپس منظر دکھاتے ہوئے حضرت ''نوح ناروی اوران کی شاعری'' پر نظر ڈالی گئی ہے اور خاص تجزیاتی حوالوں کے ساتھ اُن کے بیان کی خوبیاں اور اُن کے اسلوب کی انفرادیت سامنے لائی گئی ہے۔

مزید برآں اس حصہ میں کہیں آغا حشر کاشمیری کے مشہور ڈراما ''سلور کنگ'' کی بابت تحقیقی تذکرے کے ساتھ اُس کی تکنیکی فروگزاشت اور نوع بنوع تسامحات کا وسیع تناظر میں نہایت باریک بینی سے برجستہ تجزیہ کیا گیا ہے اور ڈاکٹر قمر جہاں کے مجموعہ مضامین ''حرف آگہی'' پر واضح تجزیاتی نگاہ ڈالی گئی ہے تو کہیں صاف طور پر یہ دکھایا گیا ہے کہ ''اردو ادب میں ہندوستانی علم واساطیر کا سحر'' کس طرح ہر زمانے میں اردو کے مشاہیر ادبا وشعرا کو مسحور کرتا رہا ہے۔

''مقالات'' کے بعد ''ابن صفی'' کے اوراق میں جہاں ایک طرف اس عظیم فن کار کی زندگی اور جاسوسی ناول نگاری پر مستزاد ''اسرار ناروی'' اور ''طغرل فرغان'' کے چہرے دکھاتے ہوئے بصورت مقالہ سیر حاصل تحقیقی وتنقیدی اور تجزیاتی مواد مہیا کردیا گیا ہے اور بصورت ''قطعات'' ان کے ہجری و عیسوی تاریخ وفات کو جگہ ملی ہے، وہیں دوسری طرف ان کی ''غزل'' اور اُن کے مزاحیہ مضمون ''ایک یادگار مشاعرہ'' کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔

یہاں ''افسانے'' کے تحت پہلی نفسیاتی کہانی ''احساس کے ویرانے میں'' جب بیگم فاخرہ کے سوال ''کیا مجھے رسوا کریں گے؟'' کے ساتھ کلائمکس کے بالکل قریب آجاتی ہے تو پھر مرزا جیسے سیماب صفت آدمی کا فیصلہ یہ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ وہ خود اس ویرانے میں گھرا ہوا تھا یا بظاہر محبت اور قربانی کی دہائی دیتے ہوئے اپنے مہمان دوست کے جواب کا سہارا لے کر اپنی نصف بہتر کو اُس ویرانے میں ڈھکیل دینے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی اپنی ناعاقبت اندیشی کا ثمرہ تھا، اس طرح اس کہانی میں ازدواجی زندگی کے سکون کی حفاظت کا جو خاموش پیغام چھپا ہے، وہ بھی محتاج بیان نہیں جب کہ دوسری کہانی میں ''کھوئی ہوئی شناخت'' کی بازیافت اور اس کے لئے عزم وکاوش کا نفسیاتی مسئلہ ومعاملہ سامنے آتا ہے اور یہ نکتہ بھی کہ تعلیم وتدریس اور تربیت سے ہی شناخت کی بحالی کا راستہ کھلتا ہے اور اس رُخ سے ماں کے ہاتھوں بیٹی کی عملاً ذہن سازی بھی اپنا پیامی مرتبہ بہرصورت ظاہر کردیتی ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ مذکورہ نگارشات کے دوش بہ دوش گل گشت خیالی کے ساتھ ''آؤ! چائے پیؤ'' کی دعوت دینے والے ''انشائیہ'' میں بھی اخلاق کے پیچھے چھپے احوال آپ کو متوجہ کریں گے اور ''گاہے گاہے باز خواں'' کے طور پر ''کہانیوں کی کہانی'' بھی خاص معلومات وانکشافات کے ساتھ یک گونہ آپ بیتی پڑھنے جیسا لطف دے گی اور پھر ''گرگٹ کے خطوط'' کا بدلتا رنگ ہی آپ کو حظ وانبساط اور فکر کی دنیا میں نہیں لے جائے گا، بلکہ سبد ''منظومات'' کے گلہائے نظم وغزل بھی آپ کا مطالعہ پر بہار بنائیں گے، ساتھ ہی ساتھ ''کتابوں کی دنیا'' بھی جالب التفات ہوگی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی انہیں فرحت ومسرت سے ہم کنار کرے گا۔زیادہ خدا حافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

مقالات

پروفیسر فاروق احمد صدیقی
Amrood Bagan, Jail Chowk (Chandwara) Muzaffarpur - 842001 (Mob. 9835660835)

صبؔا نقوی کا حمدیہ و نعتیہ کلام: ایک مطالعہ

صبؔا نقوی اُردو کے ایک معروف و معتبر شاعر کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ مدت تک وہ اپنے شعری سفر میں رواں دواں رہے اور شاید ہی کوئی ایسی صنف سخن ہو جس میں انہوں نے اپنی قادرالکلامی اور بے مثل فنکاری کے شواہد فراہم نہیں کئے ہوں۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، نعت، منقبت، رباعی اور قطعہ وغیرہ ہر میدان میں انہوں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے ہیں اور آج بھی ان کی یادیں تازہ ہیں۔ ان کے نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی غیر معمولی قدرت اور فکر و احساس میں ندرت کا سارا زمانہ معترف ہے رہی یہ بات کہ سکہ بند ناقدین نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں فرمائی تو اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ادبی سیاست نہیں کی اور نہ کسی انجمن توصیف باہمی کی رکنیت اختیار کی، ان کی فطری صفت کم آمیزی اور عزت نفس نے انہیں شہرت طلبی کے لئے کبھی اپنی سطح سے نیچے نہیں آنے دیا۔ اپنی تہذیب و شرافت انہیں ہمیشہ بے حد عزیز رہی اور سطحیت اور بوالہوسی کا ان کی حریم ذات میں داخلہ ہمیشہ ممنوع رہا۔ مزید کچھ عرض کرنے سے بہتر اور مناسب یہ ہوگا کہ بطور تحدیث نعمت اپنے بارے میں کہے گئے خود ان کے یہ اشعار یہاں نقل کر کے تمہیدی حصے کی تکمیل کر دوں۔

نام ہے میرا صبؔا ، شاعر اسلام ہوں میں
عندلیب چمن فکر خوش انجام ہوں میں
زُود گوئی پہ مری 'کن فیکون' ہے شاہد
قصر احساس میں تکوین در و بام ہوں میں

آمدم بر سر موضوع! صبؔا نقوی کا ایک ہی حمدیہ کلام میرے پیش نظر ہے جو مثنوی کے فارم میں ہے اور جس میں کل پندرہ اشعار ہیں۔ یہ حمدیہ کلام چھوٹی بحر میں ہے، مگر اس میں حیرت انگیز روانی اور تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایک استاد شاعر کا قلم کہیں عجز بیان کا شکار ہو، سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ بچوں کے پہلے ادیب اور معلم اول اسمٰعیل میرٹھی نے حمد الٰہی میں جو ایک تاریخی جملہ نثر میں کہہ دیا ہے۔ اردو کے تمام حمد نگار شاعروں کے یہاں اسی کی تقلید اور تشریحات ملتی ہیں۔ یعنی:

''اللہ ایک ہے پاک اور بے عیب ہے۔ اس جیسا
اور کوئی نہیں، وہ سب سے بڑا بادشاہ ہے۔''

اب اس تناظر میں صبؔا نقوی کی حمد کے یہ ایمان افروز اور جمال آفریں نمونے ملاحظہ ہوں۔

وہ ہے حسن ازل ، جمال ابد
وہ موحد کے واسطے ہے احد
زیب دیتی ہے اس کو خلاقی
عین فطرت ہے اس کی رزّاقی
حرف کن اس کے اختیار میں ہے
نور اس کی نظر کے تار میں ہے
حسن کا رشتہ فراز طور سے ہے
وہ تجلی خدا کے نور سے ہے

کاش اور دو چار حمدیہ کلام مل جاتے تو بات تفصیل سے ہوتی۔ نعت گوئی بڑے شرف و سعادت کی بات ہے اس پر تمام علمائے سلف، اخیار اُمت اور دانشوران ملت کا اجماع ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب ہو جو نعت پاک کی عظمت و جلالت کا قائل نہیں ہو کیوں کہ نعت سننا اور سنوانا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ شاعر بارگاہ رسالت حضرت حسان بن ثابت خود اپنے ممدوح و مداح صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر کبھی مسجد نبوی شریف میں منبر پر کھڑے ہو کر اپنی نعتیں سناتے اور آپ اپنے اصحاب کرام کے ساتھ رونق افروز ہوتے، نعتیں سنتے اور حضرت حسان کو یوں

داد دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے اللّھم ایدہٗ بروح القدس (اے اللہ حسان کی حضرت جبرئیل کے ذریعہ تائید فرما)

موقع کی مناسبت سے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت حسان کے نظریہ فن سے بھی مختصراً روشناس کرادیا جائے تاکہ نعت کی صنفی اور فنی حیثیت نورٌ علیٰ نورٌ کے مصداق ہوجائے۔

مَـا ان مـدحـت مـحـمداً بـمقـالتـی

و لـکـن مـدحـت مقـالتـی بـه محـمد

(میں نے اپنے کلام کے ذریعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ ان کا نام پاک لے کر میں نے اپنے کلام کو عظمت و ترفع بخشا ہے)

جناب صباؔ نقوی نے بھی غالباً حضرت حسان بن ثابت سے اثر پذیر ہوکر نعت گوئی کو اپنے لئے باعث نجات و مغفرت سمجھا ہے اور بجا سمجھا ہے۔ یہی ہر مومن کو سمجھنا چاہئے، ملاحظہ ہو۔

عزم و عمل کی روشنی ، سیرت پاک سے ملے
اپنے لئے نجات کا ، ہے یہی راستہ فقط
خاک دیار مصطفےٰ ، سرمۂ چشم دل بنے
جنبش خوش نگاہ ہو ، دل کی گرہ کشا فقط

اور درج ذیل شعر تو فکر بلند کے ساتھ ہی شعری لطافت کا بھی آئینہ دار ہے، کہہ سکتے ہیں کہ اس کا جمالیاتی حسن بار بار دعوت مطالعہ دیتا ہے اور ہر بار اک نئے ذائقہ سے لذت یاب کراتا ہے۔

مری نگاہ شوق میں ، ماہ و نجوم ہیچ ہیں
میرے لئے ہے کہکشاں ، آپ کی گرد پا فقط

اس سلسلہ کا یہ شعر بھی دامن کش دل ہے۔

وحدت انبیا پہ ہے، کثرت انبیا کو ناز
پھولوں میں انتخاب ہے، اک گل آمنہ فقط

اس لئے ہر وفادار امتی کا یہ وظیفہ حیات ہونا چاہئے۔

سرور کائنات تک پہنچے مرا سلام شوق
خالق کائنات سے اتنی ہے التجا فقط

ان کا یہ شعر بھی اہل فکر ونظر سے خصوصی توجہ اور داد کا طالب ہے کہ۔

بڑھے نہ منزل سدرہ سے جبرئیل خیال
کبھی بھی منھ سے کوئی ایسی التجا نہ کرے

اس شعر میں ''جبرئیل خیال'' کی ترکیب بڑی نادر اور لطیف ہے۔ ساتھ ہی فکری لحاظ سے بھی اس میں بڑی تہہ داری ہے اور اسی اقدار و معیار کے یہ اشعار بھی ہیں۔

کہکشاں سے آگے ہیں، عشق کی گزرگاہیں
چشم آرزو میں ہے ، حسن دل ربا تیرا
تیری خوش خرامی پر ، ناز ہے بہاروں کو
گلشن ولا میں ہے موجۂ صباؔ تیرا

مدح رسول کریم کتنا پاکیزہ و روح پرور عمل ہے۔ اس تعلق سے جناب صباؔ نقوی زمزمہ سرا ہیں۔

گلاب مدحت کے کھل رہے ہیں
کتاب گلزار ہو رہی ہے
نبی کی معراج کے تصدق
قلم کی رفتار ہو رہی ہے
زیارت مصطفےٰ کی حسرت
خیال کی حقدار ہو رہی ہے
صباؔ کو توفیق مدح خوانی
وفا کا معیار ہو رہی ہے

اور کیوں نہ ہو کہ علامہ اقبالؔ کا یہ شعر ان کے لئے خضر راہ بنا ہوا تھا۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو مومنین پر احسان عظیم فرمایا ہے لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا الخ (سورہ آل عمران پ۴)

اب اس حوالے سے صباؔ نقوی کے یہ نعتیہ اشعار کس قدر حقائق پر مبنی اور دل کشا نظر آتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

ذات نبی ، عطیۂ قدرت سے کم نہیں
کونین پر نوازش رحمت سے کم نہیں

شہ کی رضا رضائے مشیت سے کم نہیں
قول رسول حکم شریعت سے کم نہیں

حکم شریعت سے کم کیسے ہو کہ خود خدا ہی نے اُن کو صاحب شریعت بنایا ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی'' (سورۃ النسا، پ۴)

اس لئے ایسے رسول کریم کی غلامی اور پیروی معراج بندگی ہی کہی جائے گی۔ صؔبا نقوی عقیدت و محبت میں ڈوب کر کہتے ہیں ۔

سرکار دو جہاں کی غلامی نصیب ہو
یہ رتبہ جلیل ، سعادت سے کم نہیں
سرکار دو جہاں کی محبت میں جان دیں
یہ مرتبہ ، حصول شہادت سے کم نہیں

اُن کی ایک نعت پاک کا مطلع ہے ۔

سرکار دو عالم کی ، یہ بات نیاری ہے
رفتار بھی پیاری ہے ، گفتار بھی پیاری ہے

اُس کا ایک شعر ہے ۔

محبوب الٰہی کی تنویر کا صدقہ ہے
پیشانی آدم پر جو نور کی دھاری ہے

یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ و اسلام کے صدقے ہی عالم و آدم کی آفرینش ہوئی۔ اقبالؔ نے بھی اس عقیدۂ حق کا اظہار فرمایا ہے ۔

چشم ہستی صفت دیدۂ اعمیٰ ہو تی
دیدۂ کن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

اور اُن سے بھی پہلے مرزا رفیع سوؔدا نے اپنے نعتیہ قصیدہ میں کہا ہے ۔

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو گر اس کی
امانت دار نور احمدی ، ہوتی نہ پیشانی

اس لئے صؔبا نقوی نے عقیدۂ متوارثہ کو اپنے درج بالا شعر میں بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ زیر نظر نعت کا مقطع بھی بہت خوب اور رُوح میں اہتزاز پیدا کرنے والا ہے ۔

عکس رُخ مولا سے روشن ہے صؔبا کا دل
اک وجد کا عالم ہے ، جو ذہن پہ طاری ہے

ان کی ایک نعت کی ردیف ''مدینہ'' ہے۔ اس میں گیارہ اشعار ہیں۔ اس کا ہر شعر فکر بلند اور فن لطیف سے معمور و مزین ہے۔ پوری نعت اس اعزاز کی مستحق ہے کہ اس کی بار بار قرأت کر کے اپنے ایمان و عقیدہ میں تازگی اور نفاست پیدا کی جائے۔ چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوں ۔

ہزار غم سے نجات کی ہے بس ایک صورت چلو مدینہ
ملے گی دربار آشتی سے سکوں کی دولت چلو مدینہ
وہ ارض طیبہ ، وہ آستانہ ، جو غم کے ماروں کا ہے ٹھکانہ
جہاں کے ذرّے بھی پوچھتے ہیں ، مزاج الفت چلو

مدینہ اس لئے بھی چلو کہ ۔

زمیں سرنگوں ہے ، زماں سرنگوں ہے
دَرِ مصطفیٰ پر ، جناں سرنگوں ہے

صؔبا اس لئے بھی آرزوئے مدینہ میں مضطرب ہیں کہ وہاں کی خاک پاک ، جس کی عظمت و تقدیس پر عالم بالا کے ساکنین بھی گواہ ہیں، ان کو آواز دے رہی ہے۔ شہر مدینہ کا دوسرا نام شہر محبت اور ''شہر شفاعت نگر'' بھی ہے وہاں کسی کی آخری آرام گاہ بن جائے تو اس کو مقدر کی معراج ہی کہیں گے، اس لئے وہ پورے یقیں واذعان کے ساتھ کہتے ہیں ۔

عنایت شہ لولاک ہے صؔبا مجھ پر
میں اپنے حق میں ، مدینے کی خاک لکھتا ہوں

ان کا کرم خاص ہو جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ حاصل گفتگو یہ کہ صؔبا نقوی کی نعتیہ شاعری، اقدار و معیار دونوں لحاظ سے اردو کی نعتیہ شاعری کے سرمائے میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ معجزۂ فن کی نمود خون جگر کی آمیزش سے ہوتی ہے اور یہ خون جگر فنی ریاضت اور اخلاص و عقیدت کے ماسوا اور کچھ نہیں۔ اس نکتہ سے وہ بخوبی واقف ہیں، اسی لئے انہوں نے بڑے تیقن اور اعتماد کے ساتھ کہا ہے ۔

نبی کی شان میں جب نعت پاک لکھتا ہوں
بصد خلوص ، بصد انہماک لکھتا ہوں

یہاں صؔبا نقوی کی نعتیہ شاعری پر محض طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے، ورنہ ع
''ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ''

ڈاکٹر نظیر حسین خاں

Asst. Prof. Deptt. of Urdu, Christ Church College, The Mall Kanpur - 208001
(Uttar Pradesh) (Mob. 9935276442)

سلور کنگ کچھ تکنیکی خامیوں کے ساتھ

اردو ادب کے شیکسپیئر کہے جانے والے آغا حشر کاشمیری کے ڈرامہ ''سلور کنگ'' کا شمار اردو ادب کے بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔اس ڈرامے کے مطالعے کے دوران کہانی میں ''اب کیا ہوگا'' کا تجسس پیدا ہوتا رہتا ہے،ایک بہترین کہانی خواہ وہ ڈرامہ ہو، ناول ہو یا افسانہ اس کی یہی نشانی بھی ہے کہ آخر تک اپنے قاری کو باندھے رکھے۔ اس ڈرامے کی تخلیق ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔اس حوالے سے اس کے مختصر مقدمے میں لکھا ہے:

''آغا حشر کے ذخیرے میں اس کے تین مسودے دستیاب ہوئے۔اس کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی پیش نظر رہا، جو سرفراز قومی پریس لکھنو کا طبع شدہ ہے،لیکن اس میں سال اشاعت درج نہیں۔اس کا ایک مسودہ مجلد رجسٹر کی شکل میں ہے،جس کے اوراق بے ترتیب ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جلد میں الگ الگ دو کاتبوں کے لکھے ہوئے مسودے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ دوسرا مسودہ منتشر اوراق کی شکل میں ہے۔ یہ بھی الگ الگ کاتبوں کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔'' (سلور کنگ،ص ۵)

بالخصوص پبلشر کے اس شائع کردہ متن کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

''تیسرا مسودہ جو اس جلد میں شامل متن کی بنیاد ہے، مجلد رجسٹر کی شکل میں کل ۱۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کی تحریر کے مطابق اس کے کاتب کا نام منظور احمد عظیم آبادی اور مقام تحریر آرا، شاہ آباد (بہار) ہے۔ تاریخ تحریر ۱۷ اپریل ۱۹۲۶ء ہے، جو اس کے آغاز کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ ڈرامے کے آخر میں پٹنہ اور تاریخ ۲۹ مئی ۱۹۲۶ء درج ہے، یہ غالباً نقل کی تکمیل کی تاریخ ہے اسی صفحے پر سنسر کے دستخط بھی ہیں،جس کے نیچے تاریخ ۲ جون ۱۹۲۸ء لکھی ہوئی ہے۔ یہ واحد نسخہ ہے جو مکمل ہے۔'' (سلور کنگ،ص ۵ وص ۶)

یعنی ڈرامہ ۲۹ مئی ۱۹۲۶ء کو مکمل ہو چکا ہے اور ۲/جون ۱۹۲۸ء کو سینسر کے دستخط بھی ہو چکے ہیں۔ان صراحتوں کی روشنی میں ڈرامے پر جو سب سے پہلا سوال پیدا ہوتا ہے اس کو جاننے سے پہلے ڈرامے کا یہ قول دیکھئے:

''زلفن : تو کیا ڈنڈے سے اپنا سر پھوڑے گا؟

زیٹک اپنا سر پھوڑنے کی کیا ضرورت؟ کیا اوروں کے سر موجود نہیں ہیں؟

زلفن : مگر تو خارشتی کتے کی طرح اس وقت بوکھلایا ہوا کیوں ہے؟ ہوا کیا؟

زیٹک : ہوا کیا؟ جب تڑ سے ڈنڈا جمایا، تب مزاج ٹھکانے پر آیا۔

زلفن : ارے موئے جانگلو۔ کس کا مزاج ٹھکانے پر آیا۔

زیٹک : اسی بدتمیز گھڑی کا، جو دیوان خانے میں شیشے کے کباٹ میں رکھی ہوئی ہے۔''

(سلور کنگ،ص ۳۵ وص ۳۶)

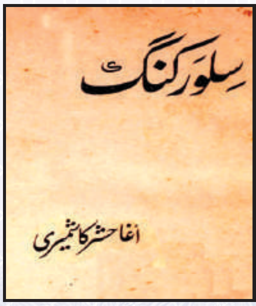

یہ مکالمہ پہلے باب کے چوتھے سین کا ہے جس میں زیٹک جو کہ زلفن کے گھر کا نوکر ہے اپنی لاٹھی سے زلفن کے گھر کی دیوار میں لگی ہوئی گھڑی کو توڑ دیتا ہے۔ اب آگے کی گفتگو ملاحظہ کیجیے جس میں گھڑی کی قیمت کا ذکر کرتے ہوئے زلفن کہتی ہے ''وہی بڑی گھڑی جو ایک ہفتہ ہوئی ڈیڑھ سو روپے کی خریدی تھی؟'' یعنی گھڑی کی قیمت ۱۵۰ روپے، وہ بھی ۱۹۲۶ء میں جس وقت یہ ڈرامہ لکھا گیا اس وقت ایک گھڑی کا ۱۵۰ روپے کا ہونا کچھ مبالغہ لگتا ہے۔ گھڑی کی اس قیمت کو کاتب یا ٹائپ کی غلطی نہیں مانا جا سکتا کیوں کہ گھڑی کی اس قیمت کا ذکر اسی قول کے فوراً بعد زیٹک کے ذریعے دوبارہ ان الفاظ میں آیا ہے:

''آپ نے ڈیڑھ سو روپے اس کی قیمت لگائی، جب ہی
تو اس کا مزاج بگڑ گیا۔ سمجھنے لگی کہ ڈیڑھ سو روپے والی کو
پانچ روپیے کے نوکر کا حکم ماننے کی کیا ضرورت ہے۔''

ایک دوسرے کردار کے ذریعے بھی گھڑی کی قیمت کو ڈیڑھ سو روپے ہی بتایا گیا، اس لیے یہ طے ہے کہ گھڑی کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہی ہے۔ اسی قول میں ایک اور دلچسپ بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی اسی گھر میں ایک نوکر کی مہینے کی تنخواہ پانچ روپے تھی۔ سوال یہ ہے کہ جس گھر میں ایک نوکر کی تنخواہ پانچ روپے ہو، اسی گھر میں ۱۵۰ روپے کی قیمت کی گھڑی ہو سکتی ہے؟ یہ گھر مرزا چونگا کا ہے، وہ پیشے سے وکیل ہیں۔ ان کی وکالت کا پیشہ بھی بہت بڑھیا نہیں چل رہا ہے، ڈرامے کے آغاز میں مصنف نے کرداروں کے تعارف میں مرزا چونگا کو ایک ''ناکارہ وکیل'' بتایا ہے اور ڈرامے کی کہانی میں بھی ان کا پیشہ نہ کے برابر چلتا ہے۔ اس کا پتا قاری کو مرزا چونگا اور اس کی بیوی زلفن کے اس مکالمے سے چلتا ہے:

''زلفن : اوئی ابھی تک تمہارا جنازہ یہیں دھرا ہوا ہے۔
میں سمجھی تھی کہ کسی چھکڑے یا بیل گاڑی میں
لد کر عدالت پہنچ گیا ہوگا۔

مرزا چونگا : مگر بیوی، کوئی مقدمہ بھی پاؤں یا عدالت میں
یوں ہی ٹیبل اور کرسی کے ساتھ سر پھوڑنے جاؤں۔

زلفن : تو یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کرو گے؟

مرزا چونگا : کیا کروں گا؟ جس طرح وہاں بیٹھ کر مکھیاں
مارتا ہوں، اسی طرح یہاں بھی جھک ماروں گا۔

زلفن : ارے میں پوچھتی ہوں کہ جب تمہیں مہینے بھر
میں دو مقدمے بھی نہیں ملتے تو یہ وکالت پاس
کرنے کی کیا ضرورت ہی کیا تھی؟''

(سلور کنگ، ص ۳۳)

ایسے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی وکالت کا پیشہ بھلے نہ چلتا ہو، مگر ان کا تعلق پہلے سے ہی اچھے گھرانے سے رہا ہوگا تو اس کے جواب میں یہ قصہ ملاحظہ کریں جسے خود مرزا چونگا پہلے باب کے چوتھے سین کے آغاز میں اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے بیان کرتا ہے:

''......میری بدنصیبی کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ ابھی میرے پیدا ہونے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں غدر ہوگیا۔ ماں کے پیٹ میں پڑا تھا کہ ابا جان مسجد سے جوتا چرانے کے جرم میں چھ مہینے کے لیے جیل میں وظیفہ پڑھنے کے لیے بھیج دیے گئے۔ دنیا میں نازل ہوا تو بمبئی سے پلیگ اور مارواڑ سے قحط ہماری آمد کا نقارہ بجانے کے لیے آ موجود ہوئے۔ عمر میں بڑھنے لگا تو خاندان کے ممبروں کی تعداد گھٹنے لگی، اسکول میں داخل ہوا تو میری برکت سے، پہلے ہی سال سو میں سے ننانوے لڑکے فیل ہوگئے۔ مرکھپ کر وکالت پاس کی اور کورٹ میں داخل ہوا تو اس روز سے کچہری کے بدلے لوگوں کے مقدمات پنچایت میں ہونے لگے، جو مہینے کے دس بیس روپے جھوٹ بول کر مل جاتے تھے، وہ بھی پنچوں کی بھینٹ ہوگئے۔'' (سلور کنگ، ص ۳۱ و ص ۳۲)

دس بیس روپے مہینے کا کمانا اور ایسے میں اپنے گھر میں ۱۵۰ روپے کی گھڑی رکھنا ایک سوال پیدا کرتا ہے، ساتھ میں یہ بھی کہ جو شخص دس بیس روپے مہینے کماتا ہے وہ پانچ روپے مہینے اپنے نوکر کو تنخواہ دیتا ہے۔ یہ بھی سمجھ سے پرے ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ مرزا چونگا بہت ہی امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے یا ان کے والدان کے لیے بہت ساری دولت چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کے والد مسجد سے جوتا چرانے کے جرم میں جیل گئے تھے۔ پیدا

ہونے سے لے کر جوانی تک مرزا کے ذریعے کوئی ایسا کارنامہ بھی نہیں ہوا کہ جس سے ان کی مالی حالت بہت بہترین ہوگئی ہو۔ مذکورہ اقوال اور بحث کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرزا کے گھریلو حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ ۱۵۰ روپے کی گھڑی اور ۵ روپے مہینے پر نوکر رکھیں۔ ڈرامے کی کہانی بہت اچھی ہے مگر اس میں اس طرح کی کمیاں بھی موجود ہیں۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ ڈرامے کے پہلے باب کے دوسرے سین کے آغاز میں جوا خانہ کے اندر کا سین دکھایا گیا ہے۔ اس سین کے آغاز میں ڈرامے کے اجزائے ترکیبی کے مطابق اس سین کا تعارف بھی ''جوا خانہ'' لکھ کر کرایا گیا ہے۔ اس سین کا آغاز بھی چند جواریوں اور شرابیوں سے ہوتا ہے۔ سین میں آغاز سے کچھ دیر تک انہیں کا ذکر چلتا ہے۔ تھوڑی دیر میں افضل بھی جوئے خانے کے اسی سین میں اندر آتا ہے۔ یہیں پر اس کا نوکر تحسین اور اس کی بیوی پروین بھی آتی ہے، ان سب میں بحث ہوتی ہے۔ اسی سین میں منیر بھی جو کہ افضل کا دوست ہے، اندر آتا ہے اور یہیں پر افضل اور منیر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ اس جھگڑے میں افضل اپنا پستول نکال کر منیر کو مارنے کے لیے دوڑاتا ہے اور دوڑاتے ہوئے (اب پہلے باب کے تیسرے سین میں) وہ منیر کے گھر میں پہنچ جاتا ہے جہاں پر پہلے سے موجود لوگ اس کو پکڑ کر بے ہوش کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد پہلے ہی باب کے تیسرے سین میں جب افضل کو ہوش آتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ میں یہاں کیسے پہنچا:

> ''یہ میں کہاں ہوں؟ منیر کے مکان میں......؟ میں یہاں کیسے آیا؟ مجھے کون لایا؟ (سوچ کر) ہاں۔ یاد آیا۔ وہ دوبارہ میرے مکان میں آیا۔ میں اس کے پیچھے پستول لے کر دوڑا۔ وہ بھاگا اور اپنے مکان میں چلا آیا۔''
>
> (سلور کنگ، ص ۲۹)

اس قول میں یہ جملہ کہ ''وہ میرے مکان میں چلا آیا'' توجہ طلب ہے، یعنی اس کے پہلے افضل اور منیر کے درمیان جو بھی جھگڑے یا بحث ہوئی وہ افضل کے مکان پر ہوئی اور وہیں پر افضل کی بیوی اور نوکر بھی تھے جن سے افضل کی گفتگو کو دکھایا گیا ہے اور سب سے بڑی بات کہ تمام شرابی اور جواری جس جگہ پر بیٹھ کر جوا کھیل رہے تھے وہ بھی افضل ہی مکان تھا، مگر ڈرامہ نگار نے پہلے باب کے دوسرے سین میں جگہ کا تعارف ''جوا خانہ'' لکھ کر کرایا ہے۔ یعنی ڈرامہ نگار سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ پہلے باب کے دوسرے سین میں جس جگہ کو جوا خانہ بتا رہے تھے، ٹھیک اس کے بعد کے سین میں اسی جگہ کو افضل کا مکان کہہ رہے ہیں۔ یعنی افضل جس جگہ سے منیر کو پستول لے کر دوڑاتا ہے وہ جگہ جوا خانہ ہے، مگر جب افضل کو ہوش آتا ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ میں یہاں کیسے پہنچا تو فلیش بیک میں سوچتے ہوئے یاد کرتا ہے کہ منیر میرے گھر پر آیا، حالاں کہ وہ افضل کا گھر نہیں بلکہ جوا خانہ تھا۔

تیسری غلطی معمولی غلطی میں آئے گی کہ پہلے باب کے تیسرے سین میں جب افضل منیر کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے گھر میں جاتا ہے اس وقت منیر کے گھر میں موجود اسد، ابو، نبو اور خود منیر افضل کو پکڑ کر بے ہوش کرنے کا جو پلان تیار کرتے ہیں، وہ یہ ہے:

> ''اسد: تو دیکھ میں یہاں کھڑا ہوں۔ تم وہاں کھڑے رہو اور تم اس جگہ۔ جیسے ہی افضل دروازہ کھول کر اندر داخل ہو۔ میں پیچھے سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لوں گا۔ تم کمر سے لپٹ جانا۔ اور تم کلوروفارم سنگھانا۔''
>
> (سلور کنگ، ص ۲۹)

آگے کا ذکر کرتے ہوئے ڈرامہ نگار یوں لکھتا ہے:

> ''سب کا تیار ہو کر کھڑے ہو جانا۔ افضل کا پستول لیے ہوئے آنا۔ سب کا افضل کو پکڑ کر بے ہوشی کا رومال منھ پر رکھنا۔ افضل کا بے ہوش ہو جانا۔'' (ص ۲۹)

یعنی سب نے مل کر افضل کو پکڑ کر ٹھیک اسی طرح بے ہوش کیا جس طرح سے انہوں نے پلان کیا تھا۔ اس کے بعد جب افضل کو ہوش آتا ہے تو وہ اپنی بے ہوشی کو یاد کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ آخر میں یہاں کیسے پہنچا اور بے ہوش کیسے ہوا؟:

> ''میں کہاں ہوں؟ اُف۔ میرے دماغ میں چکر آتے ہیں۔ سر میں دھمک، بھیجے میں چمک، خواب ہے یا عالم بیداری (اٹھ کر) ہیں۔ یہ میں کہاں؟ منیر کے مکان میں......! میں یہاں کیسے آیا؟ مجھے کون لایا؟ (سوچ کر)

ہاں! یاد آیا۔ وہ دوبارہ میرے مکان میں آیا۔ میں اس کے
پیچھے پستول لے کر دوڑا۔ وہ بھاگا اور اپنے مکان میں چلا
آیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ مجھ سے لپٹا۔ ہم
دونوں آپس میں گتھ گئے۔ پھر کیا ہوا؟ (سوچ کر) کچھ
یاد نہیں آتا۔'' (سلور کنگ، ص۲۹)

افضل کو پکڑ کر بے ہوش کرنے تک دونوں اقوال میں اختلاف ہے یعنی پہلے قول میں تین لوگ پکڑ کر بے ہوش کرتے ہیں اور دوسرے قول میں صرف منیر کا افضل سے گتھم گتھی ہوئی۔ یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ افضل نشے میں تھا اس لیے اس کو ٹھیک سے یاد نہیں کہ کمرے میں کتنے لوگ تھے، مگر افضل کا نشہ اس قدر بھی نہیں تھا کہ اس کو یہ یاد نہ ہو کہ اس کی لڑائی ایک شخص کے ساتھ ہوئی یا تین شخص کے ساتھ، جو شخص نشے کی حالت میں پستول لے کر منیر کو جگہ جگہ تلاش کر سکتا ہے اس کا نشہ اس قدر بھی نہیں کہ وہ یہ نہ جان سکے کہ اس کے جسم پر دو ہاتھ جھپٹ رہے ہیں یا چھ ہاتھ۔ یہ قول ملاحظہ ہو:

''افضل: میں پستول ہاتھ میں لیے ہوئے، منیر کو جگہ بہ
جگہ تلاش کرتا ہوا، اس کے مکان میں داخل ہوا۔ مجھے
دیکھتے ہی وہ اپنے بچاؤ کے لیے مجھ سے لپٹ پڑا۔ ہم
دونوں آپس میں گتھ کر ایک دوسرے پر غالب آنے کی
کوشش کرنے لگے۔'' (سلور کنگ، ص۴۱)

یہ گفتگو اس وقت کی ہے جب افضل ہوش میں آنے کے بعد اپنے گھر جاتا ہے اور اپنی بیوی اور نوکر کو یہ سب بتاتا ہے۔

اس کے بعد جس غلطی کی نشان دہی ہوتی ہے وہ دوسرے باب کے چوتھے سین میں ہے۔ اس میں افضل تین برس بعد واپس اپنے گھر بیوی، بیٹی اور نوکر کے پاس آتا ہے اور جب ان کی غریبی کو دیکھتا ہے تو اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چونکہ ابھی اس کو اپنی بے گناہی بھی ثابت کرنی ہوتی ہے اس لیے یہ اپنے تمام لوگوں سے اپنی اصلیت کو چھپا کر ان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ جب افضل کا نوکر ایک انجان انسان کی مدد لینے سے انکار کرتا ہے تب افضل کہتا ہے:

''افضل: بھائی شک نہ کرو۔ میں کوئی خراب آدمی نہیں
ہوں۔ میں کون ہوں اور کیا ہوں یہ میں جانتا ہوں یا خدا
جانتا ہے۔ لو، یہ روپے جاؤ ان سے ضرورت کا سامان
خرید لاؤ۔ میں آج سے روز آیا کروں گا اور تمھیں تمہاری
ضرورت کے لائق روپیہ دے جایا کروں گا۔''
(سلور کنگ، ص۷۳)

اس قول میں افضل روپے کے ذریعے اپنی بیوی، بیٹی اور نوکر کی مدد کرنا چاہتا ہے، مگر اس کا نوکر اس کی مدد کو لینے سے انکار کر دیتا ہے، مگر افضل کی اصلیت کو جاننے کے بعد جب تحسین اس کی مدد لینے کو تیار ہو جاتا ہے تب روپیوں کے بجائے اشرفیوں کا ذکر آ جاتا ہے۔ افضل کا یہ بیان دیکھیے:

''تحسین! میری ظاہری حالت بھکاری جیسی ہے، مگر
میں ٹرانسوال سے کروڑوں روپے کی دولت ساتھ لے کر
آیا ہوں۔ اگر تم روزانہ ایک سو اشرفی خرچ کرو تو بھی
ایک سو برس تک میری دولت ختم نہ ہوگی، اس لیے خدا
کے شکریے میں میرے ساتھ شریک ہو۔ یہ اشرفیاں لو
اور اپنی راحت کا سامان اور ایک عمدہ مکان خریدنے کی
تجویز کرو.....'' (سلور کنگ، ص۷۵)

اب یہاں پر یہ بات توجہ چاہتی ہے کہ تھوڑی دیر پہلے افضل اپنے نوکر کی مدد روپے دے کر کرنا چاہتا تھا، مگر اس قول میں اب اشرفیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہاں پر روپے کی جگہ اشرفیوں کا ذکر کتابت یا پرنٹنگ کی غلطی سے آ گیا ہے، اس کے بعد بھی اسی سین میں جب افضل اپنی بیٹی بانو کی مدد کرتا ہے تو اشرفیوں سے کرتا ہے:

''افضل: بیٹا ڈرو نہیں۔ میں ایک فرشتہ ہوں اور خدا کی
طرف سے یہ اشرفیاں تمھیں دینے آیا ہوں۔
بانو: یہ تو سونا ہے۔ نہیں جی، میں امی کے پوچھے بغیر ہرگز
نہیں لے سکتی۔'' (سلور کنگ، ص۷۶)

یعنی یہ طے ہو گیا کہ یہ اشرفیاں ہی ہیں۔ اس کے بعد بھی اسی سین میں جب اسد پروین کو گھر سے نکالنے کے لیے قانونی نوٹس کے ساتھ آتا ہے اس وقت اس کو جو رقم دی جاتی ہے وہ بھی اشرفیاں ہی ہیں۔

اس بحث کے بعد ایک نظر اس وقت پر بھی ڈالتے ہیں جس

وقت کا قصہ اس ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے:

''میری بدنصیبی کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ ابھی میرے پیدا ہونے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں غدر ہوگیا۔'' (سلور کنگ، ص ۳۱)

یہ قول مرزا چونگا کے ہیں۔ یعنی ۱۸۵۷ کے قریب مرزا چونگا پیدا ہو رہے ہیں۔ اب موجودہ وقت میں مرزا چونگا کی عمر کا اندازہ لگایا جائے تو ان کی عمر ۴۰ سے ۵۰ کے درمیان ہے۔ ایسے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈرامے میں سن ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۱۰ء کے درمیان کی کہانی پیش کی گئی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ پیسوں کا ذکر آیا اور پھر اشرفیوں کا بھی، کیا اُس دور میں اشرفیوں کا چلن تھا۔

اگلا سوال مرزا چونگا کے حوالے سے ہے۔ مرزا چونگا کا پہلا ذکر پہلے باب کے چوتھے سین میں دوسرا ذکر دوسرے باب کے دوسرے سین میں اور تیسرا ذکر تیسرے باب کے تیسرے سین میں ہے۔ یہاں پر بحث دوسرے باب کے دوسرے سین اور تیسرے باب کے تیسرے سین سے ہے، کیوں کہ ان دونوں ہی سین میں ایک ہی دن کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کے دوسرے سین میں جس دن کا جو واقعہ چل رہا ہے تیسرے باب کے تیسرے سین میں بھی مرزا چونگا کے گھر کا وہی واقعہ دکھایا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نبو جو کہ ایک سڑک چھاپ غنڈے کے کردار میں پولس سے بچنے کے لیے دوسرے باب کے دوسرے سین میں مرزا چونگا کے گھر میں گھس جاتا ہے، پولس گھر کے باہر سڑک پر اس کو تلاش کرتی ہے۔ نبو پولس والوں کے جانے تک مرزا چونگا کے گھر میں مرزا کو پریشان کر کے وقت کاٹتا ہے۔ جب پولس والے چلے جاتے ہیں، تب وہ مرزا کے گھر سے نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد اسی باب میں دو سین اور ہیں اور پھر اگلے باب کا آغاز ہو کر دو سین اور گزر جاتے ہیں اور تیسرے سین میں جب دوبارہ مرزا کا ذکر آتا ہے تب یہ سین اسی دن، جگہ اور واقعے کے بعد سے شروع ہوتا ہے جہاں سے دوسرے باب کے دوسرے سین میں ختم ہوتا ہے۔ یعنی کہ جن پولس والوں کے ڈر سے نبو مرزا کے گھر میں چھپا ہے جیسے ہی اس کو پتا چلتا ہے کہ یہ پولس والے چلے گئے وہ وہاں سے بہانے سے بھاگ جاتا ہے، مگر جیوں ہی وہ باہر سڑک پر کچھ دور جاتا ہے تبھی نبو کو وہ پولس والے بڑی سڑک پر اسی کی تلاش میں پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نبو ان کو دیکھتے ہی پھر واپس مرزا کے اسی گھر میں الٹے پاؤں بھاگ کر چھپنے آجاتا ہے۔ نبو کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے:

''نبو: ہائے ہائے۔ کم بختی پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ چھپتے چھپاتے بڑی سڑک تک پہنچا تھا کہ سامنے سے قطب صاحب کی لاٹ کی طرح سے اسی پیک کی شکل نظر آئی۔ آخر الٹے پاؤں اسی گھر میں پھر میں بھاگ آیا، پر وہ سترہ باپ والا کہاں گیا؟'' (سلور کنگ، ص ۱۰۴)

(ویسے بھی ڈرامہ نگار ڈرامے کے آغاز میں اس جگہ کے تعارف میں اس جگہ کو مرزا چونگا کا مکان ہی بتاتا ہے اور یہیں پر نبو آتا ہے) پھر دوبارہ اسی گھر میں یعنی مرزا چونگا کے گھر میں آتا ہے اور یہ قول نبو اس گھر میں آنے کے بعد اپنے آپ سے بڑبڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''وہ سترہ باپ والا کہاں ہے؟'' سترہ باپ کا مکالمہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ وہی تھوڑی دیر پہلے والا گھر ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے باب اور دوسرے باب کے درمیان میں تین برس کا وقت گزرتا ہے تو دوسرے باب اور تیسرے باب کے درمیان مرزا کے واقعات میں بغیر کوئی دن گزارے اسی دن کا واقعے کو پیش کرنا تنقید کو دعوت دیتا ہے، کیوں کہ دوسرے باب میں دو سین اور گزرنے کے بعد تیسرا باب شروع ہوتا ہے اور تیسرے باب میں بھی دو سین گزرنے کے بعد تیسرے سین میں مرزا اور نبو کے گھر کا قصہ پھر آتا ہے۔ اگر دوسرے باب کے تیسرے اور چوتھے دونوں سین کو ایک دن کا مان بھی لیا جائے تو تیسرے باب کے پہلے اور دوسرے دونوں سین کے واقعے پڑھنے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الگ الگ دن کے ہیں، مگر تیسرے باب کے تیسرے سین میں مرزا اور نبو کا واقعہ اسی دن کا ہے جس دن دوسرے باب کے دوسرے سین کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی یہ ایک اور تکنیکی خرابی ہے۔

اس کے علاوہ راقم اس بحث میں قاری کی توجہ ایک اور کمی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ نبو جو کہ مرزا کے ہاں دوسرے باب کے دوسرے سین اور تیسرے باب کے تیسرے سین میں ہے اگر اس واقعے کو

الگ الگ دن کا تسلیم کر بھی لیا جائے تو تیسرے باب کے تیسرے سین سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب نبو اس وقت مرزا کے گھر پر ہے تو اسی وقت پر وہ اسی باب کے دوسرے سین میں افضل کی بیٹی بانو کو اغوا کر کے اسد کے پاس کیسے لے جا سکتا ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ تیسرے باب کے تیسرے سین کا واقعہ اسی باب کے دوسرے سین کے ایک دن بعد کا ہے تو پھر نبو مرزا کے گھر کیسے جا سکتا ہے کیوں کہ دوسرے سین میں جب افضل اپنی بیوی اور بچی کو اسد کے پاس اغوا شدہ دیکھتا ہے تو وہ ابو کے ساتھ مل کر سب کو ان کے انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ جب یہ سبھی لوگ اپنے انجام یعنی یا تو موت یا پھر جیل پہنچ جاتے ہیں تو پھر نبو اگلے سین میں پھر کیسے آ جاتا ہے۔ یہ بھی اس ڈرامے کا ایک بڑا جھول ہے جو اپنی کہانی میں تمام تر خصوصیت رکھنے کے باوجود قاری کے ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں پر ڈرامہ نگار نبو کی جگہ کسی اور کردار کو رکھ کر اس کمی کو دور کر سکتا تھا۔

کردار ہی کے حوالے سے اس ڈرامے کے اندر ایک اور غلطی ہے۔ ڈرامے کے آغاز میں جہاں پر ڈرامے کی اجزائے ترکیبی کی روایت کے مطابق ڈرامہ نگار کرداروں کا تعارف کراتا ہے وہاں پر ''نبو'' کو ایک ناکارہ وکیل بتاتا ہے، مگر جب ہم ڈرامے کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلے باب کے چوتھے سین میں پہنچتے ہیں تو وہاں پر مرزا چونگا کو ناکارہ وکیل دکھایا گیا ہے، حالاں کہ کرداروں کے تعارف میں مرزا چونگا کو ایک جنرل کردار دکھایا گیا ہے ان کا پیشہ نہیں بتایا گیا ہے اور نبو جس کا تعارف ایک ناکارہ وکیل بتا کر ڈرامہ شروع کیا گیا ہے اصل میں ڈرامے کے اندر وہ ایک معمولی چور کی شکل میں قاری کے سامنے آتا ہے اور پورے ڈرامے میں اسی چور کی شکل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ایک اور چھوٹی سی غلطی جو ڈرامہ نگار سے ہوئی ہے کہ ڈرامے کے آغاز میں جس طرح تمام کرداروں کا تعارف قاری کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہیں پر مرزا کے نوکر زیٹک کا تعارف بھی ایک بیوقوف نوکر کی شکل میں پیش کر دینا چاہیے تھا۔

اس کے بعد بحث ڈرامے میں شامل ان غیر ضروری واقعات کی طرف آتی ہے جن کے شامل ہونے کا نہ تو کوئی مطلب سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی سلسلہ ڈرامے میں مزید دکھائی دیتا ہے، مثلاً پہلے باب کے تیسرے سین میں منیر کے گھر پر منیر کے دوست اسد، نبو اور ابو منیر کی دی ہوئی پارٹی میں آتے ہیں، یہاں منیر کو آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس بات کی تصدیق اس قول سے ہوتی ہے:

> ''نبو: واہ یار منیر! خوب انتظار کرایا۔ آج تم نے ہمیں پارٹی دی یا بنایا؟
>
> منیر: دوستو! معاف کرنا۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ تمہیں میرے انتظار میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا پڑا۔''
>
> (سلور کنگ، ص ۲۵)

یعنی یہ لوگ منیر کے بلانے پر منیر کے گھر آئے تھے، منیر کو آنے میں دیر ہوگئی تب تک یہ لوگ گھر میں اکیلے تھے۔ اس درمیان ان لوگوں نے منیر کے گھر میں اس کی تجوری توڑ کر دس سے بارہ ہزار کی چوری بھی کی، پھر فوراً منیر آ جاتا ہے اور پھر ڈرامے کی کہانی اسی سین میں انہیں کرداروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور دوسرا واقعہ تیسرے باب کے تیسرے سین کا ہے جس میں مرزا چونگا اپنے گھر پر جب دوبارہ اپنی بیوی کو منانے آتا ہے اور اپنے صوفے پر سو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے گھر میں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کا آنا اور اپنا رول پلے کرنا ڈرامے کے اندر ایک مزاح تو پیدا کرتا ہے، مگر ان کے آنے کی وجہ کا پتا نہیں چلتا کیوں کہ جب زیٹک نبو کے دوبارہ آنے کی خبر مرزا کو دیتا ہے:

> ''زیٹک: سرکار! کھڑکی میں سے سترہ باپ والے کو اس طرف آتے دیکھا تھا۔
>
> مرزا چونگا: اس طرف؟
>
> زیٹک: ہاں! اس طرف۔'' (سلور کنگ، ص ۱۰۸)

یہ جاننے کے بعد کہ نبو دوبارہ ادھر ہی آیا ہے وہ زیٹک سے کہتا ہے:

> ''مرزا چونگا: دیکھ! وہ اگر یہاں آئے تو اسے نہ آنے دینا۔ اگر نہ مانے تو پاگل خانے سے ڈاکٹر کو بلا کر اس کے حوالے کر دینا سمجھا!'' (سلور کنگ، ص ۱۰۸)

سین میں اس مکالمے کے بعد سے اور ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کے آنے سے پہلے تک ڈرامے میں زیٹک کا کردار غائب ہے، اس درمیان زیٹک نہ ہی ڈرامے میں منظر عام پر آتا ہے اور نہ ہی نبو پر اس کی نظر پڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پھر ڈاکٹر کو کال کس نے کیا۔ ڈرامے کے اندر ڈاکٹر اور

کمپاؤنڈر کے آنے سے مزاح تو پیدا ہوا مگر ان کے نہ رہنے سے بھی ڈرامے کی خوبصورتی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ پہلے باب کے چوتھے سین میں ایک نئی بات کا پتا چلتا ہے کہ ڈرامے میں جس وقت کا قصہ پیش کیا گیا ہے اُس وقت میں بھی یعنی تقریباً ۱۹۰۰ء-۱۹۱۰ء میں لوگوں کو ملازمت کا ملنا آسان نہیں تھا۔ مرزا کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اپنی بیوی زلفن کے سوال کے جواب میں کہتا ہے:

> ''زلفن: جب وکالت نہیں چلتی تو کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر ملازمت کیوں نہیں کر لیتے؟
>
> مرزا چونکا: تو بیوی! کیا نوکری کہیں خیرات میں بٹا کرتی ہے کہ جاؤں اور مانگ لاؤں۔ آج کل ہزاروں بی۔ اے اور ایم۔ اے دس دس روپے کی نوکری کے لیے صیغۂ مال میں، اسپتال میں، ریل میں، جیل میں، ٹرام میں، گودام میں، تار میں، اخبار میں، شہر میں، نہر میں، مال کی سپلائی میں، محکمہ صفائی میں، غرض نوکری کی ٹرائی میں، ساری خدائی میں، پیر میں چیتھڑے باندھے ہوئے 'برسو رام دھڑا کے سے۔ بڑھیا مرگئی فاقے سے' کی صدا لگاتے، ایک ایک سے خوشامدیں کرتے، سفارش لے جاتے ہیں، اپنی لیاقت کا سرٹیفکیٹ اور باپ دادا کے شجرے پڑھ کر سناتے ہیں اور اس پر بھی 'گو، یو فول' یا 'نو وَیکنسی' کہہ کر دھتکار دیے جاتے ہیں۔'' (سلور کنگ، ص ۴۴)

بچپن میں ہم لوگ گاؤں میں سنا کرتے تھے کہ ملازمت میں ہم لوگوں کے والد تک تو تھوڑا کمپٹیشن تھا، مگر ہمارے دادا کے زمانے میں تو لوگوں پکڑ پکڑ کر نوکریاں دی جاتی تھیں۔ نوکری کے لیے لوگ نہیں ملتے تھے۔ ریلوے، ملٹری، پولس وغیرہ میں گاؤں سے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ملازمت دی جاتی تھی اور یہ لوگ ملازمت چھوڑ کر بھاگ آتے تھے۔ میرے گاؤں میں تو کئی خود میرے جاننے والے تھے جو کہ حکومت کی دی ہوئی نوکری کو چھوڑ کر بھاگ آئے تھے اور یہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ آنے کا زمانہ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان کا ہے۔ ملازمت کے حوالے سے مرزا کے ذریعے آغا حشر کاشمیری نے جو مکالمہ ادا کروایا ہے وہ ڈرامے کی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے تو ٹھیک ہے، مگر اس میں زمینی سطح پر حقیقت کہاں تک ہے یہ تحقیق طلب ہے۔

پہلے باب کے پانچویں سین میں جب تحسین افضل کے جرم کو اپنے سر پر لینے کے لیے تیار ہوتا ہے، اس وقت افضل اس کو ایسا کرنے سے منع کرتا ہے تب تحسین کا جواب ایک نئی معلومات فراہم کرتا ہے:

> ''تحسین: میرے آقا! فی زمانہ انسان کی عمر کا اوسط تیس چالیس سال سے زیادہ کا نہیں ہے اور میں ساٹھ پورے کر چکا ہوں۔'' (سلور کنگ، ص ۴۳)

یعنی ۱۹۰۰ء یا ۱۹۱۰ء کے درمیان ایک ہندوستانی کی اوسط عمر تیس یا چالیس سال بتائی گئی ہے، چونکہ یہ بات ایک نوکر کہہ رہا ہے اس لیے ممکن ہے کہ وہ بولنے کے رو میں تیس اور چالیس کہہ گیا ہو اگر اس اوسط عمر کو چالیس بھی مان لیں تو آج تقریباً سو سال بعد ہم لوگ اپنی اوسط عمر کو ۷۰ سال کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، گویا ہمارے ملک نے ہر معاملے میں اور بالخصوص صحت کے معاملے میں خوب ترقی کی ہے۔

پروین کے کردار کو ڈرامہ نگار نے ڈرامے کے آغاز میں ہی ''ایک شریف پاک باز عورت'' کا خطاب عطا کیا ہے اور پورے ڈرامے کے اندر بھی تمام کردار اس کی شخصیت کی پاکی کی تعریف کرتے ہیں اور وہ پاک کردار ہے بھی۔ اس کا ثبوت ہم ڈرامے کے اندر بھی دیکھتے ہیں کہ آخر تک وہ پاکی کی حفاظت کرتی ہے، مگر ایک جگہ جہاں پر افضل منیر کے قتل کے بعد جب اپنے گھر جاتا ہے اس وقت تمام باتوں کے دوران جب اس کا نوکر تحسین افضل کی خاطر منیر کے قتل کا الزام اپنے سر لینے کو تیار ہو جاتا ہے تو افضل اس کو ایسا کرنے سے منع کرتا ہے، مگر پروین یہاں اپنی شرافت پر ایک داغ لگا جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے لیے بے گناہ تحسین کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب افضل اپنے خون لگے کپڑے کے ساتھ اپنے گھر آتا ہے اس کے بعد بحث کے دوران تحسین یہ کہتا ہے کہ آپ اپنے کپڑے مجھے دے دیجیے، میں اس کو پہن کر منیر کے قتل کا الزام اپنے سر لے لوں گا۔ یہ مکالمہ ملاحظہ کریں:

''تحسین: کپڑے اتاریے، لہو میں ڈوبے ہوئے ہاتھ دھو ڈالیے اور پستول مجھے دیجیے۔ جب پولس گرفتاری کی غرض سے یہاں آئے گی، اس وقت میں زندگی سے بیزار ایک مجرم کی طرح قبول کروں گا کہ میں منیر کا قاتل ہوں۔''

پروین: کیا۔ان کے گناہ کا کفارہ تم ادا کروگے؟

افضل: میری جان کے لیے تم اپنی جان دوگے؟

تحسین: ہاں ہاں۔ میں آپ کے الزام کا تمام بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاؤں گا۔آپ کے گھر میں پرورش پا کر، آپ کا نمک کھا کر، آج بھی کام نہ آیا تو اور کس دن کام آؤں گا......''

''افضل: تحسین کیا تو دیوانہ ہوگیا ہے؟''

(سلور کنگ، ص۴۲ و ص۴۳)

اس کے بعد تھوڑی سی اور بحث (جس میں پروین کا مکالمہ نہیں ہے) کے بعد اب پروین کہتی ہے:

''پروین: میرے سرتاج! باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جتنا جلد ہو سکے اس خطرناک حالت سے باہر نکل جاؤ (تحسین کو روتے دیکھ کر) نہ رو۔ رونے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ جاؤ بھیس بدلنے کا سامان لاؤ۔''

(سلور کنگ، ص۴۴)

یعنی شوہر کی خاطر پروین نے ایک بے گناہ کو قربان کرنا قبول کیا اور پروین کی یہی غلطی اس کے کردار پر ایک داغ لگاتی ہے۔ خیر یہ ایک انسانی فطرت ہے۔شاید ننانوے فیصد لوگ ایسا ہی کریں گے۔

اس ڈرامے کے دوسرے باب کے پہلے سین میں انسانی فطرت کا ایک اور پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ پہلے تحسین کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے جس میں جب وہ لکڑی کی ایک کرسی بنا کر بازار میں بیچ کر آتا ہے تو پروین اس سے سوال کرتی ہے:

''پروین: تحسین! تم صبح چھ بجے کے گئے ہوئے اب لوٹے۔کہاں گئے تھے؟

تحسین: قسمت کے ساتھ سر پھوڑ رہا تھا۔کل سارا دن اور آدھی رات محنت کر کے کرسی تیار کی تھی، مگر جب بازار میں لے گیا تو محنت گئی جہنم میں، بید کے بھی دام وصول نہیں ہوئے۔ آج کل کے آنکھوں کے اندھے بڑی بڑی شاپوں میں جاتے ہیں تو ایک روپیے کی چیز کے دس دس روپے دے آتے ہیں اور جب کوئی غریب کاریگر اس سے اچھی چیز بنا کر پیش کرتا ہے تو اس میں سینکڑوں عیب بتاتے ہیں۔ دس کا مال ہوتا ہے تو دو روپے دینے میں ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔'' (سلور کنگ، ص۵۴)

آج کا انسان بھی ایسا ہی ہے اور ہر دور میں ایسا ہی رہے گا کہ ایک غریب کی دکان سے سامان خریدنے پر اس سے مول بھاؤ کرے گا، بحث کرے گا اور جب یہی انسان کسی مال یا کسی بڑی دکان میں جاتا ہے تو بغیر مول بھاؤ کیے ہوئے لکھی ہوئی قیمت خاموشی سے دے کر چلا آتا ہے۔ بڑی دکان یا مال کے سامان روڈ پر بکنے والے سامان سے اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور خراب بھی ہو سکتے ہیں، مگر ان کے یہاں مول بھاؤ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہ ہم تمام انسانوں کی خاصیت ہے۔

تیسرے باب کے تیسرے سین میں ایک اور بات کا پتا چلتا ہے کہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۰ء کے پہلے عورتوں کو وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ لوگ اس کے لیے ہائی کورٹ میں گئیں اور وہاں سے بھی ان کو ناکامی ہاتھ لگی، یعنی ہائی کورٹ نے ان کو وکالت کی تعلیم کے لیے اجازت نہیں دی۔ اس سلسلے میں آغا حشر کاشمیری مرزا کے ذریعے یہ قول یوں ادا کرواتے ہیں:

''مرزا چونگا: اچھا ہوا کہ ہائی کورٹ نے عورتوں کو وکالت کرنے کی اجازت نہیں دی، ورنہ ان کے مقابلے میں مردوں کو ایک کیس بھی جیتنا مشکل ہو جاتا۔ بات بات میں ناطقہ بند۔'' (سلور کنگ، ص۱۰۷)

مضمون کے آخر میں پہلے باب کے پانچویں سین سے افضل کے اس مکالمے کے ذریعے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ:

''افضل: مگر جاؤں تو کہاں جاؤں؟ بدبو اور گناہ جہاں ہوں گے، ظاہر ہو جائیں گے۔'' (سلور کنگ، ص۴۲)

❁❁❁

ڈاکٹر یاسمین اختر
Tank Lane, Bhikanpur, Bhagalpur - 812001 (Mob. 6299062182)

ڈاکٹر قمر جہاں: حرفِ آگہی کے آئینے میں

بہار کی خاتون افسانہ گاروں میں شکیلہ اختر اور ان کی معاصرات کے بعد ڈاکٹر قمر جہاں کا نام ایک نہایت معتبر اور باوقار نام ہے۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید نگار، محقق اور ناولٹ نگار کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر قمر جہاں کے افسانے بلاشبہ اپنے دور کے آئینہ دار ہیں۔ اپنے افسانوں کے ذریعہ انہوں نے انسان دوستی، محبت والفت، امن واخوت، ایثار واخلاص کا پیغام دیا ہے، لیکن ڈاکٹر قمر جہاں کی قلمکاری کا دائرہ جیسا کہ ابھی کہا گیا، افسانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ تنقید وتحقیق میں بھی انہوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ''اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری''، ''معیار''، ''کلامِ عبداللہ حافظؔ مشکی پوری''، ''تانیثی تنقید: ممتاز شیریں سے عہد حاضر تک'' اور ''حرفِ آگہی''، ان کی ادبی تنقیدی نظر اور نظریہ کی گواہ ہے۔

ان کتابوں کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ قمر جہاں فن تنقید سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے تنقیدی مضامین میں منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں الفاظ کو تراش خراش کر وہ اپنی تحریر میں پیش کرتی ہیں اور اتنے ہی الفاظ استعمال کرتی ہیں جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر قمر جہاں کی ادبی تنقیدات کے لعل وگہر یوں تو اُن کی متذکرہ سبھی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، لیکن میں یہاں فی الوقت اُن کے ''حرفِ آگہی'' پر اپنی توجہ مرتکز رکھتے ہوئے چند باتیں حوالہ قلم کرنا چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر قمر جہاں کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ سبھی مضامین نقد ادب کا قیمتی سرمایہ کہلانے کے حقدار ہیں۔ ڈاکٹر قمر جہاں کے تنقیدی مقالوں میں ایک خاص طرز تجزیہ ملتا ہے اور ان کا اسلوب بھی نہایت عمدہ ہے۔ بقول پروفیسر علیم اللہ حالیؔ:

> ''قمر جہاں نے اگر ایک طرف ہم عصر اُردو افسانہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے تو دوسری طرف تنقید کے میدان میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کر لی ہے۔ .....قمر جہاں تخلیق کی سریت کو بے نقاب کرنے کا ہنر جانتی ہیں اور اس طرح ادب کے عام قاری کا مرتبہ بلند کرتی ہیں۔'' (حرف آگہی، ص۸ وص۹)

خود قمر جہاں نے اپنی کتاب ''حرف آگہی'' کی وجہ تصنیف پر عصری ادبی و لسانی تناظر میں یوں ایک سلگتا ہوا سوال گویا ہمارے سامنے رکھ دیا ہے:

> ''قدیم کلچر، مشرقی اقدار، فارسیت وغیرہ سے ہم بہت دُور ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا اُردو زبان کی شیرینی سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ کیا ایسے ردی ماحول میں ہمارا کلاسیکل لٹریچر زندہ رہ سکے گا اور اپنی معنویت سے نئے اذہان کو متاثر کر لینے میں کامیاب ہوگا؟'' (حرفِ آگہی، ص۳۵)

اس مجموعہ کے مضامین کو الگ الگ پانچ خانوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں چند شعرا کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں منٹو کے افسانے اور اس کے اندازِ تحریر پر

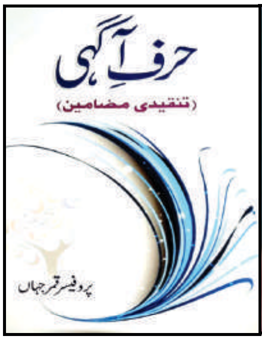

روشنی ڈالی گئی ہے۔منٹو کےتعلق سےقمر جہاں نےلکھا ہے:

''منٹو کے افسانوں کی اخلاقیات ہمارے سامنے کئی صورتوں میں آشکارا ہورہی ہیں۔اوّل تو یہ دیکھئے کہ وہ اپنے کرداروں کی پیش کش اس ہنرمندانہ انداز میں کرتا ہے کہ خراب سے خراب سیرتوں میں بھی حسن کے پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔''(حرف آگہی،ص ۸۸)

اُردو کے نامور افسانہ نگاروں میں ایک نام کرشن چندر کا بھی ہے۔ان کے افسانے زندگی کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان ہیں،بقول ڈاکٹر قمر جہاں:

''کہانی کار اپنے وقت کی آواز ہوتا ہے۔کرشن چندر بھی ایک بڑے عہد کی آواز ہیں۔ان کی کہانیوں میں دو رنگ بڑے واضح ہیں۔ پہلا رنگ رومانیت سے شرابور ہے تو دوسرا حقیقت پسندی کا نمائندہ۔''(حرف آگہی،ص ۹۶)

پروفیسر قمر جہاں صاحبہ نے کرشن چندر کا افسانہ ''پورے چاند کی رات'' کو موضوعِ بحث بنا کر ان کی شخصیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر اس باب کے آخر میں ''اردو افسانہ اور عصری حسیت'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں تین ناول پر باتیں ہوئی ہیں اور ان تینوں ناولوں میں اخلاقی قدروں کا ذکر کر کے قمر جہاں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جو تاثراتی تنقید کے بہترین نمونے ہیں۔

مجموعے کے چوتھے حصہ میں ''نقاد کا منصب اور خورشید سمیع کا تنقیدی شعور'' مصنفہ کے تجزیاتی مطالعہ کی کمان و کمند کا اسیر ہوا ہے۔ مصنفہ نے اپنی اس تخلیق کے ذریعہ موصوف کی تنقیدی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بقول مصنفہ:

''اس امر میں دو رائے نہیں کہ ڈاکٹر خورشید سمیع ایک خلاقانہ ذہن ناقد ہیں۔تخلیق کی روح میں اُترنا اور مقابلے وموازنے کی روشنی میں کسی فن پارے کا درجہ متعین کرنا کسی معمولی نقاد کے بس کی بات نہیں ہے۔''(حرف آگہی،ص ۱۶۵)

پانچواں حصہ کلیم عاجز کے نام ہے۔موصوفہ نے ''آہ کلیم عاجز صاحب'' کا عنوان رکھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔کلیم عاجز صاحب موصوفہ کے اُستاد رہے ہیں،اس لئے ان کے دل میں ان کے لئے ایک الگ مقام ہے۔ اپنے اُستادِ محترم کے بارے میں اُنہوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں لکھا ہے کہ:

''دراصل ان کے اندر ایک روحانی قوت تھی جو پہنچے ہوئے صوفی بزرگ کی ہوتی ہے۔متقی،پرہیزگار،انسان دوست، شفیق اُستاد، دانشور، عالم،غرض کیا نہیں تھے وہ، ایک منفرد و ممتاز لب و لہجے کا شاعر جس پر اکثر لوگوں کو میرؔ کا احساس ہوا،مگر یہ لہجے خود اُن کا اپنا لہجہ ہے۔اس پر ان کی شخصیت کے گہرے اثرات ہیں۔ چونکہ (ان کی) زندگی (بھی) میرؔ کی طرح غم زدہ تھی۔''(حرف آگہی،ص ۱۷۴)

''نئی غزل نیا منظر نامہ'' پر بحث کرتے ہوئے مصنفہ نے لکھا ہے:

''زندگی اِس قدر تیز رفتار ہوگئی ہے کہ منٹوں میں آج،کل میں بدل جاتا ہے اور ہر تجربہ اپنی تازگی اور نئے پن کو کھو دیتا ہے۔ دنیا ایک گلوبل سماج بن گئی ہے،ایسے میں ہر حادثہ، ہر واقعہ، ہر تجربہ اور احساس خواہ کتنا ہی نیا کیوں نہ ہو کل کی بات بن جاتی ہے کہ ہم خود نئے پن کی تلاش میں ہمہ وقت غوطہ زن رہے ہیں۔''(حرف آگہی،ص ۱۳)

مذکورہ اقتباس میں اُنہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے، بالکل دُرست کہا ہے۔ اتنے خوبصورت انداز میں وقت کی قدر و منزلت کا احساس دلانا واقعی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔اس مضمون میں موصوفہ نے چند شعرا کے اشعار کو بطور مثال پیش کیا ہے،جن سے ان کی فنکارانہ بصیرت اور مطالعاتی وسعت کا بھی کا احساس ہوتا ہے۔

اپنے مقالہ ''اختر الایمان کا شعری اُسلوب'' کے ذریعہ ڈاکٹر قمر جہاں نے اِس حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے کہ اختر الایمان کا فن بالکل منفرد اور جداگانہ ہے۔ مصنفہ کے اندازِ تحریر سے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ شاعر موصوف نے اپنے بل بوتے پر شاعری کی دنیا میں اپنی الگ مثال قائم کی ہے اور پھر اس مضمون میں اس حقیقت سے بھی واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ:

''موصوف غزل کے شاعر نہیں تھے، خالص نظم کے شاعر تھے......اختر الایمان کی اپنی ایک منفرد پہچان ہے اور اس

پہچان میں شاعر کے استفہامیہ Interogative اندازِ اظہار کا نمایاں مقام ہے۔'' (حرف آ گہی، ص ۲۸ وص ۲۹)

اختر الایمان گزرانِ وقت کا خاص تصور رکھنے والے خالص نظم کے شاعر تھے ان کے تعلق سے ڈاکٹر قمر جہاں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:

''اختر الایمان ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کی عظمت، انفرادیت پر آج تک سوالیہ نشان نہیں اُٹھایا گیا ہے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہنوزان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی گئی ہے۔ بڑی حد تک وہ ایک گوشہ گیر شاعر تھے۔'' (حرف آ گہی، ص ۳۳)

پروین شاکر ایک دانشور شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری پریشان ذہن اور اُلجھے ہوئے فکر وفن کا پتا دیتی ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر قمر جہاں کہتی ہیں:

''وہ ایک نرگسی مزاج خاتون تھیں اور غالباً یہی نرگسی مزاج ان کی ناکامی کا سبب بھی ہے۔ اپنے آپ میں گم صم رہنے والی شاعرہ خود اپنی اداؤں میں اسیر رہیں اور آئینہ میں دوسروں کے احساسات کو پرکھنے کی بھی کوشش کرتی رہیں اور جب اندر اور باہر سب کچھ بدلا بدلا نظر آیا تو یقینی طور سے ان کی تلملاہٹ نے ایک کربناک صورتِ حال کو جنم دیا، یہ تمام حقائق ان کی غزلوں کے مقابلے میں نظموں میں زیادہ روشن ہیں۔'' (حرف آ گہی، ص ۴۵)

سیاست وسماج اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب وشاعری میں بھی وقتاً مختلف تحریکیں آتی رہی ہیں اور مختلف رجحانات پروان چڑھتے رہے ہیں اور فطری طور پر اپنے اپنے وقت کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتیں۔ مرد قلم کار ہی نہیں بلکہ خاص طور سے وہ خواتین فکشن نگار بھی انہیں اپنے موضوعِ تحریر کا حصہ بنا لیتی ہیں جن کا تعلق تدریسی مشاغل سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر قمر جہاں ایک ادیبہ ہی نہیں، ایک معلّمہ بھی تھیں اس لئے ان کی کہانیوں میں جہاں ایک طرف تانیثی رجحانات سے جڑی باتیں ملتی ہیں، وہیں ان کی تنقیدوں میں بھی تانیثی نظریہ سے متعلق باتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تانیثی رجحان ظاہر ہے کہ ایک جدید رجحان ہے اور دوسرے رجحانات کی طرح اس کے بھی اچھے برے دونوں ہی پہلو ہیں۔ عورت کی حیا اور عورت کی ادا دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہمیت سے خالی نہیں، مگر جب تانیثی رجحان کے نام پر عورت کی حیا رد کر دی جاتی ہے اور عورت کی ادا ہی کو سب کچھ سمجھنے اور سمجھانے پر اصرار کیا جاتا ہے تو قرار واقعی دانشوری اس پر صاد کرنے میں بار بار ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ سوچتی ہے اور ڈاکٹر قمر جہاں کی تنقیدی تحریریں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ وہ فطری نسوانیت کو نری تـانیثیت کی وکالت کے نام پر قربان کردینے کے لئے کسی بھی طرح آمادہ نہیں اور پھر اس بات سے بھی متفق نہیں ہیں کہ قدرت نے عورت کو فکر واظہار کی جو صلاحیت، قوت اور طرز وادا بخشا ہے، وہ ہر حال میں ناقابل توجہ اور اثر ونفوذ سے خالی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے انہیں نقد ونظر کا ایک امتیازی تختِ تحریر نصیب ہے اور زیر مطالعہ کتاب ''حرف آ گہی'' میں بھی جو کچھ ہے، وہ دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ ان کا یہ اختصاص منور کر دیتا ہے۔ ''شاعرات اُردو اور نئے رُجحانات'' میں قمر جہاں نے ایک اچھوتا اسلوب اختیار کرتے ہوئے مختلف شاعرات کی شاعری کو بخوبی پیش کیا ہے اور عورت کے جذبات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے عشرت آفرین کا ایک دل پذیر درج کیا ہے ۔

لاکھ پتھر ہوں مگر لڑکی ہوں
پھول ہی پھول ہیں اندر میرے

اس مقالے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شاعرات کا کلام ان کے فکر واُسلوب کو ایک ایسی انفرادیت عطا کرتا ہے جو اُن کے عہد کے دوسرے شعرا سے کم نہیں، بقول قمر جہاں:

''خواتین کے یہاں مرد اساس معاشرہ سے بغاوت کا لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہوتا جارہا ہے۔ اب وہ 'وفا کی دیوی' اور 'حیا کی مورت' کی جگہ ایک نئے پیکر میں اُبھر رہی ہیں ......نسوانی شاعری جو اَب تک دبے دبے لہجہ میں ہورہی تھی اچانک تیزی سے باغیانہ آہنگ اختیار کرتی جارہی ہے۔'' (حرف آ گہی، ص ۶۸ وص ۶۹)

مضمون کے آخری حصہ میں اُنہوں نے کہا ہے:

''ہماری شاعرات کافی فعال ہوچکی ہیں۔ وہ اپنی کوشش میں

لگی رہیں تو انشاءاللہ تعالیٰ وہ دن دُور نہیں جب خواتین کی
صف میں سے کوئی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور اختر الایمان
کی نمائندگی کرنے کے لئے سامنے آجائیں۔''

(حرف آگہی، ص ۸۳)

کوثر صدیقی موجودہ دَور کے ایک کامیاب شاعر و ایڈیٹر اور مخلص شخص ہیں۔ جدید شاعری میں اُنہوں نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ ان کے بارے میں موصوفہ کیا کہتی ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''وہ شعر و شاعری کو محض دل بہلانے کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔
وہ اسے ایک فنِ شریف کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جو
ایک اعلیٰ مفکرانہ ذہن کی پہچان ہے، غالباً اسی لئے ان کے
یہاں فرد یا ذات کے کرب کی جگہ اجتماعی شعور کا احساس
اُجاگر ہے۔'' (حرف آگہی، ص ۵۵)

مشرف عالم ذوقی کے ناول ''نالۂ شب گیر'' اور ذکیہ مشہدی کے ناول ''پارسا بی بی کا سنگھار'' کے بارے میں موصوفہ نے کم صفحات میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ دونوں ناولوں کو پڑھنے کی چاہت ہونے لگتی ہے۔ ان کے اندازِ تحریر سے اِس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ محض ناول نہیں، بلکہ ادبی تہذیب و تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے۔ ایک اچھے تنقید نگار کا فرض ہے کہ وہ تخلیق کار کی دونوں صورتوں کو واضح کرے اور پروفیسر قمر جہاں اپنے ان فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ بقول مصنفہ:

''ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ کہانی کی مربوط اور متاثر کن
شروعات کرنے کے لئے ناول کا بنیادی سرا یہیں سے
ہونا چاہئے تھا اور شروع میں بیان کردہ باتیں ناول کے
اختتام میں ہونی چاہئے تھی کیونکہ فکشن کا کام قاری کو
مرعوب کرنا نہیں، متاثر کرنا ہے۔'' (حرف آگہی، ص ۱۱۸)

ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' مصنفہ: صادقہ نواب سحر کا جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مقالہ پڑھنے کے بعد کہانی تھوڑی بہت سمجھ میں آتی ہے، لیکن پوری کہانی سامنے نہیں آتی جیسا کہ مصنفہ نے کہا ہے:

''کہانی کی تہہ ادھیڑنا ہمارے نزدیک قاری کے حصے کی چیز
ہے، لہٰذا میں خلاصہ بیان کرنے سے ہمیشہ گریز کرتی ہوں۔
اس سے متن کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔'' (حرف آگہی، ص ۱۲۲)

اس بیان کے بعد صادقہ نواب سحر کے بارے میں وہ مزید کہتی ہیں:

''صادقہ ایک ہونہار قلمکار ہیں، خاص طور سے فکشن میں
وہ کچھ نئے نرالے انداز پر چلنا پسند کرتی ہیں۔''

(کہانی کوئی سناؤ متاشا، ص ۱۳۳)

افسانے میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو سامنے لایا جاتا ہے جب کہ ناول میں پوری زندگی میں اخلاقی قدروں کو موضوع بنا کر اس کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر جہاں نے کہا ہے:

''ایک وقت تھا جب اردو میں ناول کی تعداد دوسرے
اصنافِ سخن کے مقابلے میں بہت کم تھی، مگر دیکھتے دیکھتے
انگنت نئے، نرالے اور حالیہ موضوعات کا احاطہ کرتے
ہوئے اتنے سارے ناول اور ناولٹ سامنے آگئے ہیں کہ
آج کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ اس نے یہ تمام
ناول پڑھ لیے ہیں۔'' (حرف آگہی، ص ۱۵۷)

بلاشبہ ''حرف آگہی'' میں قمر جہاں نے نہ صرف برجستہ تجزیہ نگاری کا حق ادا کیا ہے، بلکہ اپنی ایک نئی تنقیدی زبان کا استعمال کر کے اپنی تخلیقی توانائی کا بھرپور ثبوت بھی دیا ہے۔ ان کی زبان بالکل سیدھی سادی ہے اور سادہ اور اثر انگیز زبان ہونے کی وجہ سے کتاب کی اہمیت یقیناً کافی بڑھ گئی ہے اور انہیں ایک الگ پہچان ملی ہے۔ موضوع سے الگ ہٹ کر بات کرنے والے تخلیق کار اکثر بہک جاتے ہیں، لیکن قمر جہاں نے جس طرح گھریلو واقعات کو پیش کیا ہے ان سے ذہن اُلجھتا نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ نہایت قرینے اور سلیقے سے وجہ مسرت بنتا چلا جاتا ہے۔

قمر جہاں کی اس کتاب پر نظر ڈالتے ہوئے پروفیسر شین اختر کے یہ الفاظ یقینی طور سے اس مضمون کے لئے خیر ختام کے مصداق ہوں گے، انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میں نے 'حرفِ آگہی' کے مختلف مضامین کو دیکھا، پڑھا اور اس
نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قمر جہاں کی تنقید میں حکمت و دانائی کے رموز
(پنہاں) ہیں۔ ان کا اُسلوب بے حد شگفتہ اور مدلل ہے۔''

❁❁❁

ڈاکٹر ندیم احمد
Faculty, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi - 110007 (Mob. 9136162160)

اردو ادب میں ہندوستانی علم و اساطیر کا سحر

اردو ادب ہندوستان کی ثقافتی، روحانی اور تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم آئینہ ہے، جو ہندوستانی علم کے نظام کی گہرائیوں سے جڑا ہوا ہے۔ یہ نظام، جو ویدوں، اپنشدوں، پرانوں، رامائن، مہابھارت اور لوک روایات سے تشکیل پاتا ہے، ہندوستان کی قدیم حکمت، فلسفہ اور اخلاقی اقدار کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ ہندوستانی اساطیر میں دیوتاؤں جیسے وشنو، شیو اور دیوی، رشیوں اور مافوق الفطرت ہستیوں کی کہانیاں شامل ہیں، جو نہ صرف مذہبی بلکہ سماجی و اخلاقی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ رامائن میں رام دھرم، فرض اور سچائی کی علامت ہیں، جب کہ مہابھارت میں کرشن حکمت اور رہنمائی کے مظہر ہیں۔ اسی طرح، لوک داستانیں جیسے ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہیوال انسانی جذبات، محبت اور قربانی کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ سب ہندوستانی علم کے نظام کا حصہ ہیں، جو اردو ادب کو گہرائی اور تنوع عطا کرتے ہیں اور اسے ہر دور میں جلا بخشتے ہیں۔

ہندوستانی علم کا نظام، جو علم، روحانیت اور سماجی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے، اردو ادب کی روح بن کر ابھرتا ہے۔ اس نظام کی جڑیں ویدک فلسفہ میں پیوست ہیں، جہاں آتما اور پرماتما کے اتحاد کا تصور مرکزی ہے۔ یہ تصور صوفی شاعری میں گہرے طور پر سمایا، جہاں ہندوستانی اساطیر کو اسلامی تصوف کے ساتھ ملایا گیا۔ بلھے شاہ نے جو پنجابی صوفی شاعری کے عظیم فن کار ہیں اور جن کا اثر اردو ادب پر نمایاں ہے، نئے ہیر رانجھا کی داستان کو اپنے کلام میں سمو کر الٰہی محبت کا پیغام دیا۔ ان کے اشعار میں ہیر اور رانجھا محض عاشق و معشوق نہیں، بلکہ وحدت الوجود کے فلسفہ کی علامت ہیں۔ ان کا ایک مشہور کلام ہے کہ ہیر رانجھے میں جذب ہو جاتی ہے، جو ہندوستانی علم کے نظام کے آتما اور پرماتما کے تصور سے ہم آہنگ ہے۔ تحقیق کے مطابق، صوفی شاعری نے ہندوستانی اساطیر کو تصوف کے رنگ میں ڈھال کر ایک ایسی ادبی روایت قائم کی جو گنگا جمنی تہذیب کی عکاس ہے۔ (انیس ناگی: ''اردو ادب اور صوفیانہ روایات'') یہ امتزاج اردو ادب کو ہندوستانی علم کے نظام کی ایک روشن مثال بناتا ہے۔

اردو شاعری میں ہندوستانی اساطیر کا استعمال صرف روحانی پیغامات تک محدود نہیں، بلکہ یہ سماجی اور سیاسی بیداری کا ذریعہ بھی بنا۔ علامہ اقبالؔ نے ہندوستانی علم کے نظام سے متاثر ہو کر رامائن کے رام کو ایک مثالی انسان اور رہنما کے طور پر پیش کیا۔ ان کی نظم ''رام'' میں رام کو دھرم اور انصاف کی علامت دکھایا گیا، جو ہندوستانی تہذیب کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اقبالؔ نے اساطیری کرداروں کو جدید تناظر میں پیش کر کے اردو شاعری کو ایک عالمگیر پیغام دیا۔ ان کے اشعار میں رام ہندو مسلم اتحاد کی علامت بن کر ابھرتے ہیں، جو ہندوستانی علم کے نظام کی ہم آہنگی اور شمولیت کی قدروں سے جڑتا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ نے اساطیری روایات کو ہندوستانی علم کے نظام کے فلسفیانہ ڈھانچے کے ساتھ ملایا، جس سے اردو شاعری کی گہرائی میں اضافہ ہوا (ڈاکٹر کلیم عاجز: ''اقبال کی شاعری میں تہذیبی عناصر'') یہ انداز بلاشبہ ہندوستانی اساطیر کو عصری مسائل سے جوڑتا ہے۔

اردو نثر نے بھی ہندوستانی علم کے نظام کی روشنی میں اساطیر اور داستانی روایات کو اپنایا۔ پریم چند نے، جو اردو اور ہندی ادب کے عظیم نثر نگار ہیں، اپنے ناولوں میں دیہی ہندوستان کی زندگی کو پیش کیا، جہاں پورانک کہانیوں کی اخلاقیات کرداروں کے فیصلوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کا ناول ''گئودان'' ہوری نامی ایک کسان کی جدوجہد کی داستان ہے، جو دھرم اور کرم کے درمیان کشمکش میں گرفتار ہے۔ ہوری کا کردار رامائن کے رام سے متاثر ہے، جو فرض کی خاطر قربانی دیتا ہے۔ پریم چند نے ہندوستانی نظام علم کے اقدار، جیسے ایمانداری اور فرض شناسی، کو سماجی حقیقت پسندی کے ساتھ ملایا، جس سے ان کی تحریریں سماجی تبدیلی کا

ذریعہ بنیں۔ تحقیق کے مطابق، پریم چند نے لوک داستانوں اور اساطیر کو اپنی نثر میں شامل کرکے اردو ادب کو عوامی سطح پر مقبول بنایا (ڈاکٹر رام چندر: ''پریم چند کا ادبی تناظر'') ان کی تحریروں نے ہندوستانی علم کے نظام کی گہرائی کو عام آدمی تک پہنچایا۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں ہندوستانی اساطیر کا علامتی استعمال ہندوستانی علم کے نظام کی اخلاقی اور فلسفیانہ قدروں سے جڑتا ہے۔ ان کے ایک افسانے میں ایک عورت کو مہابھارت کی دروپدی سے تشبیہ دی گئی، جو سماجی ناانصافیوں کے خلاف لڑتی ہے۔ یہ علامتیں بیدی کے افسانوں کو گہرائی بخشتی ہیں اور قاری کو عصری مسائل پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بیدی نے اساطیری کرداروں کو ہندوستانی علم کے نظام کے تناظر میں پیش کرکے اردو نثر کو ایک نئی جہت دی (پروفیسر قاضی افضال حسین: ''اردو افسانے کی روایت'') یہ انداز ہندوستانی اساطیر کو عصری ادب سے جوڑتا ہے اور اردو نثر کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔

لوک داستانیں، جو ہندوستانی علم کے نظام کا ایک اہم حصہ ہیں، اردو ادب میں عوام کی آواز بن کر ابھرتی ہیں۔ پنجاب کی ہیر رانجھا، سندھ کی سسی پنوں اور سوہنی مہیوال جیسی کہانیاں محبت، قربانی اور جدوجہد کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ یہ داستانیں ہندوستانی علم کے نظام کی سادگی اور گہرائی کی عکاسی کرتی ہیں جو انسانی جذبات اور اخلاقی اقدار کو اجاگر کرتی ہیں۔ امیر خسرو نے جو اردو ادب کے ابتدائی معمار ہیں، اپنی شاعری اور نثر میں لوک روایات کو شامل کیا۔ ان کی کہانیاں جیسے ''بیچھن ہتھکڑی''عوامی تخیل کی عکاسی کرتی ہیں اور ہندوستانی علم کے نظام کی روایتی حکمت کو پیش کرتی ہیں۔ تحقیق کے مطابق، خسرو نے لوک داستانوں کو اردو ادب میں سمو کر اسے زمین سے جوڑا (ڈاکٹر وارث مجید: ''امیر خسرو اور اردو ادب'') یہ روایات اردو ادب کو ہر طبقے کے لئے قابل رسائی بناتی ہیں۔

مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' ہندوستانی علم کے نظام کی لوک روایات سے متاثر ہے۔ اگرچہ یہ ناول ایک تاریخی کردار پر مبنی ہے، لیکن اس میں محبت، جدائی اور قربانی کے موضوعات لوک داستانوں سے ملتے ہیں۔ امراؤ جان کی جدوجہد ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنی شناخت کے لئے لڑتی ہے، جو ہیر اور سسی کی قربانیوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ رسوا نے لوک داستانوں کی جذباتی گہرائی کو تاریخی تناظر کے ساتھ ملایا، جو ہندوستانی نظام علم کے اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس ناول نے لوک روایات کو اردو نثر میں زندہ رکھا (ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی: ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ'') یہ ناول ہندوستانی علم کے نظام کی پائیدار کشش کو ظاہر کرتا ہے۔

ہندوستانی علم کا نظام اردو ادب کو ایک عالمگیر شناخت دیتا ہے۔ رامائن اور مہابھارت جیسی مہا کاوی کہانیاں دھرم اور نیکی کی اس لڑائی کو پیش کرتی ہیں، جو اردو شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنایا۔ فیض احمد فیضؔ کی شاعری، اگرچہ زیادہ تر سیاسی اور سماجی موضوعات پر ہے، لیکن ان کے کچھ اشعار میں اساطیری علامتیں ہندوستانی علم کے نظام سے جڑتی ہیں۔ فیضؔ نے محبت اور جدوجہد کو اساطیری حوالوں سے پیش کیا، جو ان کے پیغام کو گہرا کرتا ہے۔ اسی طرح، انتظار حسین کے افسانوں میں اساطیر اور لوک روایات کو جدید مسائل کے ساتھ جوڑا گیا۔ ان کے افسانے تقسیم ہند کے صدمات کو اساطیری علامتوں سے بیان کرتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق، انتظار حسین نے ہندوستانی علم کے نظام کو عصری تناظر میں پیش کرکے اردو ادب کو بلندی دی (ڈاکٹر انور سدید: ''انتظار حسین کا افسانوی اسلوب'') یہ تخلیقات ہندوستانی علم کے نظام کی عصری اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اردو ڈراموں میں ہندوستانی علم کے نظام کی جھلک نمایاں ہے۔ امتیاز علی تاج کا ڈراما ''انارکلی'' تاریخی ہونے کے باوجود لوک داستانوں کی رومانوی روایت سے جڑتا ہے۔ انارکلی کی قربانی ہندوستانی علم کے نظام کی محبت اور فرض کے اقدار کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی طرح، آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں میں پورانک کہانیوں کے عناصر ملتے ہیں، جو عوام میں مقبول ہوئے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ آغا حشر نے اساطیری موضوعات کو ڈراموں میں شامل کرکے اردو تھیٹر کو نئی شناخت دی (ڈاکٹر عتیق اللہ: ''اردو ڈرامے کی تاریخ'') یہ ڈرامے ہندوستانی علم کے نظام کی گہرائی کو عوام تک لے گئے۔

ہندوستانی علم کا نظام گنگا جمنی تہذیب کی ایک خوبصورت مثال ہے۔صوفی شاعروں نے اساطیر کو اسلامی تصور کے ساتھ ملایا۔ خواجہ میر دردؔ نے اپنی شاعری میں ہندوستانی فلسفہ اور لوک روایات کو سموکر وحدت الوجود کا پیغام دیا۔ بلھے شاہ نے اساطیری داستانوں کو صوفیانہ فکر سے جوڑا، جس سے ان کی شاعری عالمگیر ہوئی۔تحقیق کے مطابق،صوفی شاعری نے ہندوستانی علم کے نظام کو ایک نئی روحانی جہت دی (ڈاکٹر خالد محمود ''صوفی شاعری اور ہندوستانی تہذیب'') یہ امتزاج اردو اب کو مختلف ثقافتوں کے لئے قابل قبول بناتا ہے۔

اردو ادب نے ہندوستانی علم کے نظام کو سماجی اور سیاسی بیداری کے لئے استعمال کیا اور جیسا کہ ذکر آچکا اقبالؔ نے رام اور کرشن کے حوالوں سے اصلاحات کی بات کی۔فیضؔ نے اساطیری علامتوں سے سماجی نا انصافیوں پر روشنی ڈالی۔ انتظار حسین نے مہابھارت اور لوک داستانوں سے تقسیم کے صدمات بیان کئے۔تحقیق کے مطابق، ان ادیبوں نے ہندوستانی علم کے نظام کو ایک طاقتور پلیٹ فارم بنایا (ڈاکٹر صغیر افراہیم: ''اردو ادب اور سماجی بیداری'') یہ تخلیقات اس نظام کی پائیدار طاقت کو ظاہر کرتی ہیں۔

ہندوستانی علم کا نظام اردو ادب کو ایسی گہرائی دیتا ہے جو اسے ہر طبقے کے لئے پرکشش بناتا ہے۔ بلھے شاہ کی سادگی، اقبالؔ کی فلسفیانہ گہرائی، پریم چند کی حقیقت پسندی اور انتظار حسین کی علامتی کہانیاں اس نظام سے روشنی لیتی ہیں۔ یہ ادب ہمیں اپنی جڑوں سے جوڑتا ہے اور ہماری کہانیوں کی رنگینی اور گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ روایات ہندوستانی تہذیب کی عظمت کی عکاسی کرتی ہیں اور اردو ادب کو ایک ایسی آواز دیتی ہیں جو ہر دل تک پہنچتی ہے۔

اردو ادب میں ہندوستانی علم کا نظام ایک ثقافتی پل کا کردار ادا کرتا ہے، جو مختلف مذاہب اور روایات کو جوڑتا ہے۔صوفی شاعروں سے جدید ادیبوں تک، ہر ایک نے اس نظام کو اپنے انداز میں پیش کیا، جس سے اردو ادب کی وسعت میں اضافہ ہوا۔ یہ نظام ہندوستانی معاشرے کے اخلاقی اور روحانی ڈھانچے کی عکاسی کرتا ہے، جو اردو ادب کو عالمگیر بناتا ہے۔تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایات اردو ادب کی جڑیں، مضبوط کرتی ہیں۔(ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ''اردو ادب کی ثقافتی جڑیں'')

یہ ادبی روایات ہندوستان کی تہذیبی کثرت کو اجاگر کرتی ہیں۔رامائن اور مہابھارت دھرم کی بات کرتی ہیں، جب کہ ہیر رانجھا اور سسی پنوں انسانی جذبات کو چھوتی ہیں۔ان روایات نے اردو ادب کو ایک ایسی زبان عطا کی جو عالمی سطح پر اپنی شناخت رکھتی ہے۔ بلھے شاہ کے اشعار صوفیانہ شاعری کے شائقین کے لئے اثاثہ ہیں اور اقبالؔ کی شاعری نے ہندوستانی تہذیب کو عالمی تناظر میں پیش کیا۔ یہ سب ہندوستانی علم کے نظام کی بدولت ممکن ہوا۔

اردو ادب کی یہ گہرائی و گیرائی اسے دیگر زبانوں سے ممتاز کرتی ہے۔اساطیر نے اسے روحانی بلندی دی اور لوک داستانوں نے اسے عوامی مقبولیت عطا کی۔ پریم چند کے ناول، بیدی کے افسانے، فیضؔ کی شاعری اور انتظار حسین کی کہانیاں ہندوستانی علم کے نظام کی جھلک پیش کرتی ہیں۔یہ روایات ادب کو خوبصورت بناتی ہیں اور سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

ہندوستانی علم کا نظام اصلاً اردو ادب کی جڑیں ہیں، جو اسے ایک مضبوط شناخت دیتی ہیں۔ یہ روایات ہندوستانی تہذیب کی گہرائی کو ظاہر کرتی ہیں اور اردو ادب کو ایک ایسی زبان بناتی ہیں جو ہر دل تک پہنچتی ہے۔ بلھے شاہ سے انتظار حسین تک، ہر ادیب نے اس نظام سے روشنی لی۔ یہ ادب ہمیں ہماری ثقافتی جڑوں سے جوڑتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ ہماری کہانیاں خوبصورت اور معاشرے کو بدلنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

نجم الزماں
Chandwara, Muzaffarpur - 843328

نوؔح ناروی اوران کی شاعری

انیسویں صدی کی آخری دو دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدائی چھ دہائی کا زمانہ پانے والے، ہندوستان کے مایہ ناز ارباب سخن میں استاد شاعر حضرت نوؔح ناروی کا نام بجاطور پر نہایت ہی ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ اپنے نانیہال نہوانی پور ضلع رائے بریلی میں عین عیدالفطر کے دن ۱۲۵۶ھ کو پیدا ہوئے۔ انگریزی کلینڈر کے لحاظ سے یہ ۱۶ردسمبر ۱۸۷۹ء جمعہ کا دن تھا۔ ان کے والد مولوی عبدالمجید قصبہ نارہ، الہ آباد کے ایک بڑے رئیس اور زمیندار تھے، چنانچہ اسی رعایت سے وہ خودکو ''نوؔح ناروی'' لکھتے تھے۔ گھر پر فارسی اور عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی بھی پڑھی۔ ان کی شادی ۲۷ مارچ ۱۸۹۶ء کو ہوئی تھی اور جیسا کہ ''جامع اردو انسائیکلو پیڈیا'' (جلد اوّل) میں درج ہے:

''انہیں شعروسخن کا ذوق میر نجف علی کی صحبت میں پیدا ہوا، شروع میں انہیں سے اصلاح لی، پھر امیؔر مینائی سے مشورہ کیا۔ آخر میں فصیح الملک داغؔ دہلوی کے باقاعدہ شاگرد ہوگئے۔ داغؔ دہلوی کے بلانے پر حیدرآباد گئے اور عرصہ تک وہاں قیام کیا۔ داغؔ کے انتقال کے بعد ان کے سبھی شاگردوں نے جانشینی کا دعویٰ کیا تھا، لیکن نوؔح کی خودنوشت سوانح کے مطابق داغؔ کی جانشینی ان کے حصہ میں ہی آئی۔''

بخت بلند کی یاوری ہوتی رہے تو یقیناً اس کا کوئی مقابلہ اور کوئی جواب نہیں، نوؔح ناروی کا سلسلۂ تلمذ اس کی ایک روشن مثال ہی کہلائے گی کہ ایک طرف انہیں امیؔر مینائی کی شاگردی ملی جو لکھنؤ سے قدیمی نسبت رکھتے تھے تو دوسری طرف انہیں حضرت داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ نصیب ہوا جن کی پرورش لال قلعہ میں ہوئی تھی اور جنہیں بہادر شاہ ظفؔر نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوؔق دہلوی کے سپرد کیا تھا۔ اس طرح یہ یقیناً ایک بات نہیں، بڑی بات ہے کہ نوؔح ناروی کا سلسلۂ سخن صرف ایک واسطہ سے ذوؔق دہلوی تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر امیؔر مینائی اپنے وقت کے ایسے محترم ومقبول شاعر تھے کہ واجد علی شاہ نے اپنے دربار میں بلاکر ان کا کلام سنا تھا تو دوسری طرف رام پور اور حیدرآباد کے درباروں میں داغؔ کی بھی بے پناہ پزیرائی ہوتی رہی تھی۔

امیؔر مینائی کا شاعری میں داغؔ کے حریف کی حیثیت سے شہرت پانا ایک الگ بات ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ داغؔ اور امیؔر کے پرستاروں کی اگر کمی نہیں، تو ان دونوں کے شاگردوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں اور ان کے اوصاف بھی کچھ کم روشن نہیں۔ داغؔ کے کلام کی تاثیر اور شاعری میں ان کے اعجاز کا ایک زمانہ کل بھی قائل تھا اور آج بھی ہے اور داغؔ کی شاعری کا پرتو، نوؔح ناروی کے یہاں اس حد تک نمایاں رہا کہ وہ شاگردی سے جانشینی کے مرتبے تک پہنچے۔ ''داغؔ کا جانشین'' اور ''داغؔ کا آخری شاگرد'' ہونے کی بات چاہے مزید تحقیق اور بحث کی گنجائش سے خالی نہ ہو، مگر اتنی بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ اپنے طرز کی بدولت اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک پرگو شاعر اور جیسا کہ ذکر آچکا، ایک استاد شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد یادگار چھوڑی جن میں نوؔر نوحی آروی جیسے ان کے بہاری تلامذہ بھی شامل ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جگیشر پرشاد خلشؔ کے زیر اہتمام، گیا میں کانگریس کے آل انڈیا اجلاس کے موقع پر جو کل ہند مشاعرہ ہوا تھا اس میں نوؔح ناروی نے نہ صرف شرکت کی تھی بلکہ اپنی طویل غزل بھی پڑھی تھی، اس غزل کے دو شعر ڈاکٹر نظام الدین احمد نے اپنے تعزیتی مضمون میں نقل کیا ہے ؎

اب تمیز نیک و بد اے اضطراب دل نہیں
کچھ قصور ایسے میں ہو تو جرم میں شامل نہیں

وادیٔ الفت میں رہرو کس لئے ہوں بدحواس
منزل مقصود ان کی اب کئی منزل نہیں

نوحؔ ناروی ایک زمیندار آدمی تھے اور جیسا کہ انہیں قریب سے دیکھنے والوں نے بتایا ہے، بہرحال ان کی وضع داری اور منکسر مزاجی بھی مثالی تھی۔ وہ دبلے پتلے میانہ قد آدمی ضرور تھے، مگر پرانی قدریں انہیں بیحد عزیز تھیں اور وہ ایک کامیاب منتظم بھی تھے۔ ان کے ذاتی تعلقات ایک طرف ملک کے اُس وقت کے وزیراعظم پنڈت نہرو سے تھے تو دوسری طرف سکھ دیو پرشاد بسملؔ الہ آبادی اور اودھ کشور پرشاد کشتہؔ گیاوی کو بھی ان کی شاگردی پر ناز تھا۔

نوحؔ ناروی کا انتقال اپنے وطن نارہ میں ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ ''آزاد ایشیا'' گیا ۱۷رنومبر ۱۹۶۲ء میں اُن پر جو تعزیتی مضمون چھپا تھا اُس میں نمونہ کلام کے طور پر ان کی کئی غزلیں بھی شامل ہیں۔

نوحؔ ناروی غیرمنقسم ہندوستان کے ان شاعروں میں محسوب ہوتے ہیں جنہوں نے شاعری کے ذریعہ بھی کافی دولت کمائی اور ظاہر ہے کہ یہ ان کی خاندانی دولت پر مستزاد تھی۔ وہ مشاعروں کے نہایت محترم اور مقبول شاعر تھے، ایسے شاعر کہ انہیں کے بیان کے بموجب دہلی، کراچی، لاہور اور پشاور وغیرہ کے بڑے بڑے مشاعروں میں انہیں نہ صرف بلایا جاتا تھا بلکہ رخصتانہ کے طور پر پانچ سو روپے اور کئی تھان کپڑے بھی نذر کئے جاتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' میں حضرت نوحؔ ناروی کی غزلوں پر قدرے ساقط از تہذیب پیروڈی کی اشاعت اور ان کی غزلوں میں بعض ناقدین کی طرف سے ''نیاپن نہ ہونے'' کی شکوہ سنجی اپنی جگہ، لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ان کے یہاں اساتذہ کے اصولوں کی مبینہ پابندی ملتی ہے۔ وہ داغؔ کے شاگرد تھے اور داغؔ اسکول کے ممیّزات ایک امانت سمجھ کر خود اپنے پاس بھی رکھتے تھے اور اپنے تلامذہ میں بھی تقسیم کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہی نہیں، ان کے شاگردوں کے کلام میں بھی زبان و بیان کی چاشنی اور محاوروں کا بکثرت استعمال پایا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نظام الدین احمد:

''حضرت نوحؔ ناروی بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ بات کرتے کرتے شعر موزوں کر لیتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں ایک نئے رواج کو جنم دیا۔ الفاظ کو دہرا کر بات میں بات پیدا کردیتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کی ایک غزل کا بڑا چرچا تھا جس کا مقطع ہے ۔

کہا ہم نوح کو چھیڑیں؟ کہا تم نوح کو چھیڑو
کہا طوفان کا ڈر ہے ، کہا طوفان تو ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ نوحؔ صاحب اپنے طرز کے بڑے شاعر تھے۔ کسی مقطع کو انہوں نے طوفان سے علاحدہ نہیں کیا۔ ان بہت سی خوبیوں کے علاوہ وہ ایسے شاعر تھے جو اردو اخبار اور رسالے خریدتے بھی تھے۔'' (مقالہ بہ عنوان ''حضرت نوحؔ ناروی، مطبوعہ آزاد ایشیا گیا، ۱۷رنومبر ۱۹۶۲ء مشمولہ بہ مجموعہ مضامین ''قافلہ جو گزر گیا'' ڈاکٹر نظام الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ ۱۹۷۸ء ص ۱۰۸ و ص ۱۰۹)

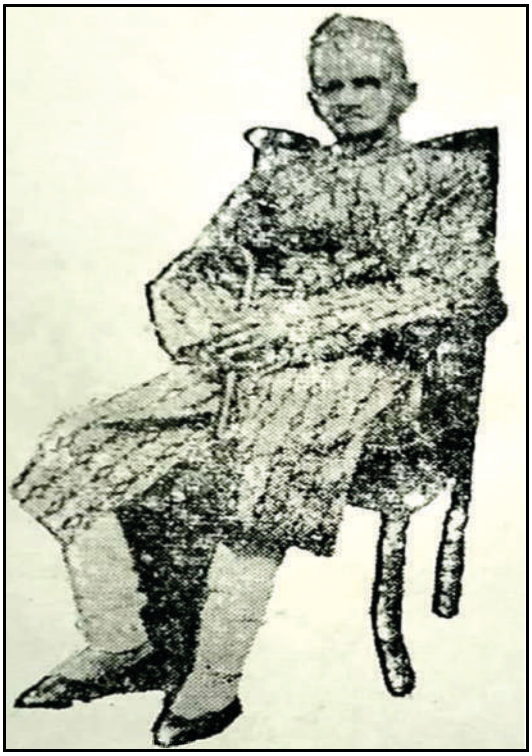

(تصویر نوحؔ ناروی ماخوذ بشکریہ ''قافلہ جو گزر گیا''
ڈاکٹر نظام الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۷۷ء روبرو، ص ۱۱۲)

درج بالا اقتباس کی آخری سطروں میں حضرت نوؔح ناروی کے ایک معمول شریفہ کا جو ذکر ہوا ہے، وہ ممکن ہے آج کے اردو معاشرے میں کل سے کہیں زیادہ قابل توجہ قرار پائے، لیکن ہمیں یہاں اس موضوع کی طرف آنے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا موقع، بلکہ اس اقتباس کے حوالے سے مزید جس بات کا ذکر ہمارے لئے حسب موقع ہوسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں مذکورہ مقطع دراصل اُسی غزل کا مقطع ہے جس کی ''زمیندار'' نے اپنے طور پر یہ کہہ کر کھلی اُڑائی تھی کہ ؎

کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں؟ کہا تم اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے ، کہا کوہان تو ہوگا
کہا موتوں سڑک پر میں؟ کہا موتو سڑک پر تم
کہا چالان کا ڈر ہے ، کہا چالان تو ہوگا

مقطع نوؔح اور اس کی ''زمیندارانہ'' پیروڈی کا ایک رُخ تو وہی ہے جو ابھی ذکر میں آیا اور دوسرا رُخ یہ بھی ہے ان اشعار میں اس بات کے لئے خاص ذہن سازی کی گئی ہے کہ بہرحال شرارتوں کا خوف ہی فطری نہیں ہوتا بلکہ اس خوف کے عین مطابق شرارتوں کا انجام بھی بالکل یقینی اور فطری ہوا کرتا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ کے حوالے سے حضرت نوؔح ناروی نے بیسویں صدی کا جو زمانہ پایا تھا، اُس زمانے کے شاعروں میں مضؔطر خیرآبادی، بیخؔود دہلوی، سائؔل دہلوی، اسؔد حیدرآبادی، ساغؔر نظامی، روؔش صدیقی اور وحشتؔ کلکتوی کا نام بھی آتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان میں ''جو ذرہ جہاں ہے، وہیں آفتاب ہے'' کے مصداق سبھی شاعر اپنے اپنے طرز سے، پڑھنے والوں اور سننے والوں کو اپنا معترف بنالیتے ہیں اور انہیں اپنی اپنی مستحکم شناخت دے جاتے ہیں اور حضرت نوؔح ناروی کی غزلیہ باقیات بھی بہرصورت اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔

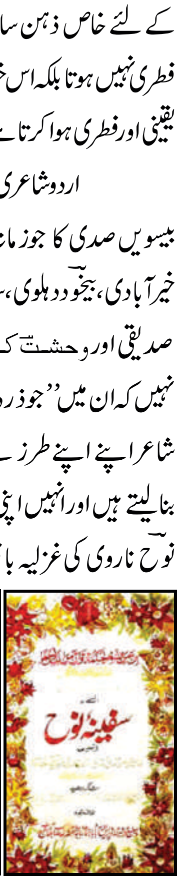

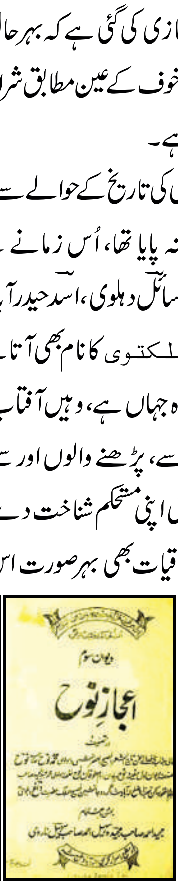

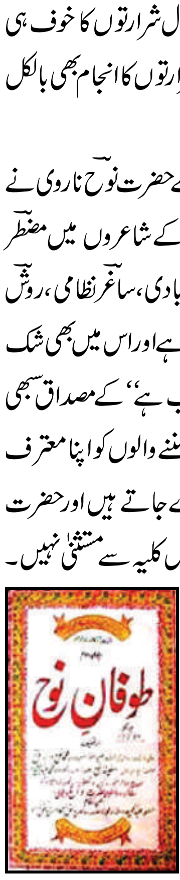

''سفینہ نوؔح''، ''اعجاز نوؔح''، ''طوفان نوؔح''، ''مقالات نوؔح'' اور ''مکتوبات نوؔح'' وغیرہ ان کی کتابیں اشاعت یافتہ ہیں۔ نوؔح ناروی نے چھوٹی بحروں میں بھی لکھا ہے اور طویل بحروں میں بھی، لیکن دونوں ہی صورتوں میں ان کا طرز کلام اپنی جگہ سلامت ہے اور دامن دل کھینچ لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

حضرت نوؔح ناروی اصلاً حسن زبان کے شاعر ہیں اور اگر یہ بات غلط نہیں کہ غزل کا تعلق ''نوشتن'' سے نہیں ''گفتن'' سے ہے تو پھر کہنا چاہئے کہ نوؔح ناروی کی غزل طرز تکلم کی آن بان اور شان سے بکلی تمام مرصع ہے اور ظاہر ہے کہ بایں صورت ان کے یہاں ردصدرو عروض اور ردّ عروض و ابتدا کی صنعت کے وافر نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ بطرز ردّیات تکرار کا استعمال چاہے مثل آہن کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، لیکن اس فن کا لوہا بہرصورت ان کے دست سخن میں آکر موم ہو جاتا ہے۔ انہیں چھوٹے چھوٹے اور بالکل ہی سادہ سادہ سے جملے سے مصرعوں کی تعمیر کا خاص ہنر آتا ہے اور صلہ و جزا کی بحسن تمام یکجائی میں وہ نہایت چیرہ دست ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرز و ترتیب کی وجہ سے ان کے یہاں سلاست و روانی کا وصف بھی دوبالا ہوگیا ہے، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے صنعت تضاد و تقابل سے بھی بخوبی کام لیا ہے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُن کے یہاں سوال و جواب کی صنعت بھی جگہ جگہ روشن ہے ؎

جگر بیتاب ، دل مشتاق تم کیا حکم دیتے ہو
اِدھر بیٹھے ، اُدھر بیٹھے ، کدھر تیر نظر بیٹھے

عجب حال دیکھا تمہاری نظر کا
کبھی مل گئی ہے ، کبھی لڑ گئی ہے

میں درد و غم کا قصہ پورا نہ کہہ سکوں گا
اندازہ آپ کر لیں سن کر اِدھر اُدھر سے

حضرت نوؔح ناروی دیکھتے ہیں کہ ع
جتنے انسان ، اتنی مشکلیں ، اطوار الگ ، انداز جدا
اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ع
ہم دنیا کو دنیا نہ کہیں، دنیا تو عجائب خانہ ہے

اور یہ بھی کہ انہوں نے زندگی و موت کے لازمی رشتے کو بڑی سادگی سے بعض مقامات پر نظم کر دیا ہے ۔

یہ آنا ہی مرا دنیا میں تھا تمہید جانے کی
نہ میں زیرِ فلک ہوتا نہ میں زیرِ زمیں ہوتا

اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت نوحؔ ناروی نے چار دن کی زندگی کے شخصی تجربے کو جس سادگی اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا ہے، وہ بھی دیدنی ہے ۔

چار دن کی زندگی میں یہ نہ پوچھ اے ہم نشیں
کیا مجھے کرنا پڑا ، سننا پڑا ، کہنا پڑا

یہ زندگی کے گوناگوں جبرِ پیہم کی ایک مکمل تصویر ہے جو یہاں شاعر نے چند لفظوں سے بنا دی ہے۔ مزید اُن کا یہ شعر بھی دیکھئے ۔

چار کو خوش ہم نے رکھا، چار سے ہم خوش ہوئے
چار دن کی زندگی میں اپنی گزری اس طرح

نوحؔ ناروی کی غزلوں میں یہ نہ صرف زورِ بیان کے جلوے ہیں بلکہ موضوع و مضمون کے لحاظ سے اُن کے یہاں اخلاقیات کی آفاقی قدریں بھی نہایت حسن ادا کے ساتھ سامنے لائی گئی ہیں ۔

غیروں کے واسطے جو پریشان ہوگیا
انسان بھی نہ تھا تو وہ انسان ہوگیا

زمانہ مصیبت کا ٹل جائے گا
ڈھلی رات تو دن بھی ڈھل جائے گا

حقیقت یہی ہے کہ وقت پر ہمدردی کا بے لوث جذبہ جاگ اُٹھے تو اسی کا دوسرا نام انسانیت ہے اور یہ بھی کہ نہ تو آدمی کو اندھیروں کے وقت میں گھبرانا چاہئے اور نہ ہی جب اُجالوں کا وقت آئے تو اترانا چاہئے، اس لئے کہ دھوپ چھاؤں قدرت کا ازلی و ابدی نظام ہے۔ نوحؔ ناروی کی غزلوں میں طنز لطیف کا بھی اپنا ایک انداز ہے ۔

میرے حق میں ہے بہت کچھ یہ کرم بھی آپ کا
اوپری ہی دل سے گو پوچھا، مگر پوچھا مجھے

اثر ہو نہ ہو مگر یہ خوشی ہے
ترے کان تک میری تقریر پہنچی

یہاں صرف طنز اور محاورہ ہی نہیں بلکہ پہلے شعر میں دوسرے مصرع کا تحت نقاط ہونا بھی شعر کی بہاروں میں اضافہ کر رہا ہے، پھر معاملہ بندی کے تعلق سے بھی نوحؔ کے اشعار میں بیساختگی اور خوبصورتی دیدنی ہوتی ہے ۔

نیچی نظر میں آپ کی ، ترچھی نگاہ میں
کتنی ہے شرم کتنی شرات نہ پوچھئے

نوحؔ ناروی کے یہاں اگر ایک طرف عشق کی پیہم مجبوریوں کا نقشہ پورے زورِ بیان کے ساتھ کھینچ دیا گیا ہے تو دوسری طرف بہاریہ اور خمریہ مضمون کی یکجائی بھی حسن تضاد کے ساتھ لطف و اہتزار سے خالی نہیں ۔

کیا ستم، کیا رشک، کیا آزار، کیا غم، کیا ملال
عشق میں سب کچھ دلِ بیتاب کو سہنا پڑا

فقط بہار میں پیتے ہیں ، ہم نہیں پیتے
کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد

بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ فن پر دسترس کی کمی لکھنے والے کو ضرورت شاعری کے لئے غیر محسوس طریقے سے ہی سہی، مگر حشو و زوائد کی مدد لینے پر مجبور کر دیتی ہے، لیکن نوحؔ ناروی جیسے استادِ فن کا یہ فن حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ وہ محض چند لفظوں کے الٹ پھیر سے اس طرح مطلب آشکار کر دیتے ہیں کہ بیک نظر اس کا احساس بھی تا دیر نہیں ہوتا اور جب احساس ہوتا ہے تو حیرت فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے، مزید یہ بھی کہ ان کے یہاں تخیل کا رنگ بھی کچھ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ پڑھنے والے التزام تعلیق کے ساتھ اسے دیکھ کر چونک اٹھتے ہیں ۔

جہاں پاؤں جوشِ جنوں نے نکالے
قدم بوس ہونے کو زنجیر پہنچی

بیشک نوحؔ ناروی کا یہ پیغام آج بھی اپنی معنویت سے محروم نہیں ۔

پھر یہ باتیں نہ ہوں گی مرے بعد
غور سے سنئے ، بات ہے میری

(اردو انسائیکلو پیڈیا اور جامع اردو انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل نیز ڈاکٹر نظام الدین احمد کے مضمون ''حضرت نوحؔ ناروی'' مطبوعہ آزاد ایشیا، گیا ۱۷ نومبر ۱۹۶۲ء، مشمولہ ''قافلہ جو گزر گیا'' سے خصوصی استفادہ کے ساتھ) ❁❁

ابن صفی

درخشاں جبیں
Alamganj, Patna - 800007

ابن صفی اور اُن کے جاسوسی ناول

یہ آج سے لگ بھگ پچھتّر سال پہلے کی بات ہے، اُس کے احباب اُس سے کہا کرتے تھے:

تم نے طغرل فرغان اور اسرار ناروی کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ اگر انہیں زندہ رکھا ہوتا تو ادب عالیہ میں تمہارا بھی کوئی مقام ہوتا۔''

اور وہ اس کے جواب میں کہا کرتا تھا کہ بس اس طرح میں:

''ادب عالیہ کی شمع جلائے پانچ دس آدمیوں کے حلقے میں نظر آتا۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، مجھے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے اور کیا یہ کسی ادبی شہ پارے سے کم ہے؟ میری کتابیں الماری کی زینت نہ بنتی ہوں، لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملتی ہیں۔''

یہ ایک ٹکڑا ہے اُس فن کار کے سوانحی تذکرے کا جسے دنیا ابن صفی کے نام سے جانتی ہے۔ ممکن ہے اُس وقت بھی سننے والوں کو کہنے والے کی خودستائی کا ذرا سا احساس ہوا ہو اور آج بھی اسے پڑھنے والے یہ محسوس کریں کہ بظاہر خودستائی اور مبالغہ سے اس کا ایک رشتہ بن سکتا ہے، لیکن فی الواقعہ کل بھی یہ بات ایک زمینی حقیقت تھی اور آج انٹرنیٹ اور موبائیل کے دور میں بھی بہت کچھ تبدیلی کے باوجود یہ ایک زمینی حقیقت ہی کہلائے گی کہ ابن صفی کے قارئین اور شائقین سرحد کے اِس پار سے اُس پار تک ہی نہیں بلکہ مختلف مما لک میں آباد، اردو کی نئی نئی بستیوں تک بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ ابن صفی نے، جیسا کہ ان کے سوانح نگار بتاتے ہیں، ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ کی کہی ہوئی یہ بات اپنی گرہ میں ہمیشہ کے لئے باندھ ہی نہیں لی تھی کہ:

''اردو میں محض جنسی افسانے اور فحش لٹریچر کی مارکیٹ ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا۔''

بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ جنسی لٹریچر کے اس سیلاب کو روکنے کا حتمی ارادہ بھی کر لیا تھا اور ناول میں ناولٹی کے فقدان کا منظرنامہ بدلنے کی خاطر جاسوسی ناول لکھنے کے لئے قلم بدست ہو گئے تھے۔

جاسوسی ادب یعنی جاسوسی ناول اور افسانے اصطلاحی زبان میں ''سری ادب'' کہلاتے ہیں۔ یہاں قصہ اور پلاٹ کی بنیاد جاسوسی اور سراغ رسانی پر ہوتی ہے۔ سراغ رساں یا کھوجی کا دائرہ نسبتاً محدود ہوتا ہے یعنی وہ صرف اپنے آس پاس ہونے والے جرائم اور خصوصاً قتل، اغوا، چوری جیسے جرائم سے تعلق رکھتا ہے جب کہ ایک جاسوس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور بڑا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ کسی ایک ملک یا کئی ملک کے لئے دوسرے ملکوں کے خفیہ رازوں کی جاسوسی کرتا ہے، ان کے مہلک اور طویل المیعاد منصوبوں کا پتہ لگاتا ہے اور اسے طشت از بام کر کے انہیں ناکام بنانے کی راہ نکالتا ہے۔ یہاں برسبیل تذکرہ یہ اشارہ نامناسب نہیں کہ ابن صفی کے ناولوں میں عمران، فریدی اور حمید وغیرہ جو کردار آئے ہیں وہ بیک وقت کھوجی بھی ہیں اور جاسوس بھی اس لئے کہ وہ قتل اور اغوا جیسے جرائم کی تفتیش کرتے ہوئے بھی ملتے ہیں اور اُن بڑے بڑے قومی اور بین الاقوامی جرائم کی بھی، جن کا تعلق ملک دشمن اور دشمن ملک کی تباہی پسند سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جاسوسی اور جرم میں سدا کا اٹوٹ تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو داستانوں میں جاسوسی عناصر بہت پہلے سے موجود تھے، لیکن کسی بھی جگہ جاسوسی یا سراغ رسانی کو مرکزیت نہیں دی گئی تھی۔ یہ تو احسان بلکہ تاریخ ساز احسان ہے ابن صفی کا کہ انہوں نے قرار واقعی طور پر اردو میں جاسوسی ناول نگاری کی طرح ڈالی اور مارچ ۱۹۵۲ء میں ایک ''دلیر مجرم'' کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ ''جاسوسی دنیا'' کا یہ ''دلیر مجرم'' نکہت پبلی کیشنز الٰہ آباد کی اشاعتی ہمت سے قاری کے ہاتھ

لگا تھا۔ ''دلیر مجرم'' کی آمد سے پہلے بقول شکیل جمالی:

''اردو میں صرف تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم پائے جاتے تھے یا دو تین ناول ظفر عمر کے تھے اور وہ بھی ان کا تخلیقی کارنامہ نہیں تھا بلکہ، اس البیلا تک کے چند ناولوں کو مقامی رنگ وروغن میں پیش کر دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو جاسوسی ناول نگاری میں ابن صفی ایک عہد کے موجد ہیں'' (مضمون بہ عنوان ''اجالے تیری یادوں کے''، شکیل جمالی، جاسوسی دنیا، الہ آباد ۱۹۸۰ء، ص ۱۰)

ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کا سلسلہ تین دہائیوں پر مشتمل رہا اور اس انداز اور شان وشوکت کے ساتھ چلتا رہا کہ ''جاسوسی دنیا'' کے مدیر عباس حسینی، اس عظیم فن کار کے رخصت ہو جانے پر اپنے تعزیتی ادارتی شذرہ میں یہ لکھنے سے خود کو روک نہیں سکے کہ:

''ابن صفی اب کسی شخصیت کا نام نہیں رہ گیا تھا بلکہ ایک روشنی کا نام تھا جس نے جاسوسی ادب کو اپنی تخلیقات سے روشن ومنور کر رکھا تھا۔ ابن صفی پورے ایک عہد کا نام تھا جس کا سلسلہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۸۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ابن صفی ایک اسلوب کا نام تھا جو اردو ادب کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا......ابن صفی پورے ۳۲ سال سے میرے دوست اور رفیق کار رہے ہیں، ۱۹۴۸ء میں جب ماہنامہ 'نکہت' کا اجرا ہوا تھا تو اسرار (ابن صفی) میرے معاون تھے، پھر ۱۹۵۳ء میں میری فرمائش پر وہ جاسوسی دنیا کے لئے ہر ماہ ایک ناول لکھنے لگے اور یہ سلسلہ ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہا۔'' (تعزیتی ادارتی تحریر بہ عنوان ''آہ ابن صفی''، جاسوسی خط الہ آباد ۱۹۸۰ء)

درج بالا اقتباس میں ایک لفظ ''اسرار'' آیا ہے۔ یہ دراصل ابن صفی کے اصل نام ''اسرار احمد'' کی طرف اشارہ ہے۔ ابن صفی کی تاریخ ولادت ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء (یا جامع اردو انسائیکلو پیڈیا کے مطابق اپریل ۱۹۲۸ء) اور جائے ولادت الہ آباد کا ''نارہ'' نامی قصبہ ہے۔ ان کے والد کا نام صفی اللہ تھا اور اسی نسبت سے انہوں نے کنیت کے انداز میں اپنا قلمی نام ابن صفی رکھا۔ اس کے علاوہ ان کے دو قلمی نام اور بھی تھے۔ ایک اسرار ناروی جسے انہوں نے اپنے وطن نارہ کی نسبت سے اختیار کیا تھا اور اسے شاعری میں تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے، جب کہ ان کا دوسرا قلمی نام ''طغرل فرغان'' تھا جس سے وہ اپنے طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں کام لیا کرتے تھے۔

ابن صفی کے والد محترم ملازمت سے وابستہ آدمی تھے اور اس سلسلے میں زیادہ تر باہر ہی رہا کرتے تھے اور وطن کی تقسیم کے بعد کراچی چلے گئے تھے۔ ان کے وہاں انتقال کی خبر ''جاسوسی دنیا'' الہ آباد کے شمارہ ۱۵۲ میں قدرے تاخیر سے چھپی تھی، یہ وہی شمارہ ہے جس میں ابن صفی کے ناول ''دیوپیکر درندہ'' کی اشاعت ہوئی ہے۔ یہاں برسبیل تذکرہ یہ لکھ دینا بھی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ''جاسوسی دنیا'' الہ آباد کے جس شمارے میں ''آہ ابن صفی'' کے عنوان سے عباس حسینی کا تعزیتی شذرہ چھپا ہے، وہ شمارہ ابن صفی کے ناول ''رات کا بھکاری'' پر مشتمل ہے اور اس کے بعد ''ابن صفی کے سلسلے میں مضامین ان کے حالات زندگی اور پڑھنے والوں کے تاثرات پر محتوی جو شمارہ منظر عام پر آیا تھا، اس میں ابن صفی کے ناول ''آوارہ شہزادہ'' کی اشاعت ہوئی ہے۔

ابن صفی کے نام کے ساتھ ان کی تعلیمی سند بھی بیشتر کتابوں پر

اردو میں جاسوسی ناولوں کا خالق ابن صفی — ۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء کو خالق حقیقی سے جا ملا لیکن جب تک اسکی تحریریں باقی ہیں وہ ہر دل ودماغ میں اپنی سحر انگیز مسکراہٹوں کے ساتھ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

ماخوذ بشکریہ جاسوسی دنیا ۱۹۸۰ء

مرقوم ہوتی ہے یعنی ''ابن صفی، بی اے'' کہنے تو ابن صفی نے آرٹس میں محض گریجویشن تک کی سند لی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے انہیں زبردست ذہانت سے نوازا تھا اور ان میں بے پناہ علمی ذوق تھا جو اصل میں انہیں اپنے ننھیالی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا۔

ابن صفی کے پرنانا حکیم احسان علی اپنے وقت میں طب یونانی کے ماہرین میں گنے جاتے تھے اور مشہور و معروف شاعر حضرت نوؔح ناروی ابن صفی کے نانا تھے جو بڑی زمینداری رکھتے تھے۔ ابن صفی کی والدہ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں اور اپنے دو لڑکوں کی صغر سنی ہی میں موت کے بعد انہوں نے اپنی ساری دولت اور جائیداد اپنی بیٹی کے نام وقف کر دیا تھا۔

بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے، اس سے قطع نظر جہاں تک ابن صفی کے تعلیمی کوائف کی تفصیلوں کا تعلق ہے، اس کا خلاصہ یوں سامنے آتا ہے کہ ابتدائی تعلیم اور نارہ کے پرائمری اسکول میں پڑھنے کے بعد وہ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ جس کا نام بلاغت تھا، الٰہ آباد چلے آئے اور یہاں کے واحد مخلوط کالج سے جس کا نام ایونگ کرسچن کالج تھا، انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا، مگر یہاں سے گریجویشن کرنے کی بجائے کسی وجہ سے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور ۱۹۴۸ء میں گریجویشن کے فوراً بعد ۱۹۴۹ء سے ''یادگار حسینی اسکول'' میں مدرس ہوگئے، یہاں ان کی ملازمت کا سلسلہ ۱۹۵۳ء تک رہا، پھر اسی سال وہ کراچی چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں گزار کر ۱۹۸۰ء میں آسودۂ لحد ہوئے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ۲۶ جولائی، ابن صفی کے ولادت کی تاریخ بھی ہے اور یہی ان کی رحلت کی تاریخ بھی ہے۔ ابن صفی نے آخری ناول ''آخری آدمی'' کے نام سے لکھا تھا جو ''جاسوسی دنیا'' میں شکیل جمالی کی اطلاع کے بموجب اُن کی وفات کے ماہ و سال تک نہیں چھپا تھا۔ اسی طرح شکیل جمالی نے اپنے مضمون ''اجالے تیری یادوں کے'' میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اپنی نگرانی میں ''نیا رخ'' نامی ماہنامے کے چھ شمارے مرتب کرا چکے تھے اور اس کے لئے خصوصی ناول ''شمال کا فتنہ'' بھی انہوں نے مکمل کر لیا تھا، مگر موت نے انہیں مزید مہلت نہیں دی اور ان کی زندگی میں ان چیزوں کی اشاعت نہیں ہوسکی۔

ابن صفی نے اگر چہ ماہ و سال کے لحاظ سے بہت زیادہ لمبی عمر نہیں پائی، لیکن اس سچائی سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ ان کی تحریروں کو مثالی مقبولیت و شہرت نصیب ہوئی اور اسی حوالے سے انہیں آج بھی زمانہ یاد کرتا ہے۔ ان کی کتابیں بلاشبہ اکیسویں صدی کے لئے بیسویں صدی کا وہ انمول تحفہ ہیں جس پر اردو والے جتنا بھی فخر کریں کم ہوگا۔ ابن صفی کے یہی اصلاً وہ کارنامے ہیں جن سے جہانِ ادب میں انہیں عمر دوام ملی ہے۔

ابن صفی کے سوانحی احوال کی طرف دیکھیں تو یہ کہنے میں کچھ بھی مبالغہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے وقت کے ان نونہالوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ؂

بالائے سرش ز ہوشمندی　　می تافت ستارۂ بلندی

بیشک کم سنی سے ہی ان کے سر پر بلندی اور ہوشمندی کا ستارہ چمک رہا تھا اور اُسے اُس وقت کے بڑے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے بھی لگے تھے۔ بات ۱۹۴۲ء کے آس پاس کی تھی جب ساتویں، آٹھویں جماعت میں پڑھنے والے اسرار احمد نے اپنے شوق سے داستان ''طلسم ہوش ربا'' کی ساری جلدیں پڑھ ڈالی تھیں اور ابھی وہ ڈی اے وی اسکول میں ساتویں جماعت کے ہی طالب علم تھے کہ ''ناکام آرزو'' (یا جامع اردو لغت کے مطابق صرف ''آرزو'') کے نام سے انہوں نے اپنی پہلی کہانی لکھی تھی اور وہ کہانی عادل رشید کے ہفت روزہ اخبار ''شاہد'' بمبئی میں چھپی تھی۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۴۲ء کے اندولن کے زمانے کی بات ہے کہ اس چودہ سالہ نوجوان نے اس تحریک سے متاثر ہوکر ایک انقلابی نظم بھی تحریر کی تھی۔ اس نظم کے چند شعر، شکیل جمالی نے ابن صفی پر لکھے گئے اپنے تعزیتی مقالے میں بھی نقل کئے ہیں ؂

اب چھوڑ بھی دو میرا دامن ، للّٰہ نہ روکو جانے دو
وہ دیکھو افق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
بن جائے گا لالہ زار وطن ، کچھ دیر میں شہدا کا مدفن
گر راہِ وفا میں کام آؤں، سیندور سے مانگ بھرے رہنا
بندی نہ مٹانا ماتھے کی ، تم میری راہ تکے رہنا
میں خواب میں اکثر آؤں گا، سینے میں آس رکھے رہنا

ان حوالوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابن صفی کی ادبی زندگی کا آغاز، اُن کے عین عنفوان شباب میں ان کی شاعری اور فکشن تحریر سے ہوا۔ دراصل ہمارے ادب میں ابن صفی تین حیثیتوں سے آتے ہیں اور ہمیں اپنے قلم کی جولانیوں کا معترف بنالیتے ہیں۔

ان کا پہلا چہرہ ''اسرار ناروی'' کا چہرہ ہے جو ثانوی تعلیم کے دور سے ہی اُبھرنے لگا تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے نام کا پہلا جزو لے کر اور اسے اپنے وطن یا یوں کہا جائے کہ اپنے نانا نوحؔ ناروی کی نسبت سے اپنا قلمی نام بنایا بلکہ انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہیں اور کسی حد تک جگرؔ مرادآبادی سے متاثر ہوکر خمریات میں بھی طبع آزمائی کی۔ اُس وقت کے حالات اور ماحول کے زیر اثر، جنگ آزادی کے تعلق سے لکھی گئی ان کی نظم ''آخری التجا'' کے علاوہ ''سوگ'' اور ''ویرانہ'' وغیرہ بھی نہایت کامیاب نظمیں ہیں۔ انٹرسکنڈ ایر کے طالب علم کی حیثیت سے ''حلقہ احباب'' کے زیر اہتمام ''بزم ادب'' کی نشست میں انہوں نے ''بنسری کی آواز'' کے عنوان سے جو نظم پڑھی تھی وہ بھی نہایت خوبصورت نظم ہے ۔

ابھی تو دور سے آئی تھی بنسری کی صدا
دُکھوں میں ڈوبی ہوئی، درد میں نہائی ہوئی
نہ جانے کان میں کیا کہہ گئی کہ یاد آئی
کہانی میری کہی اور تری بھلائی ہوئی
فضا میں تیرتی قازوں نے جس کو دہرایا
یہ بازگشت تھی گویا سنی سنائی ہوئی
یہ چاہتا ہوں کہ بجھ جائے، پر نہیں بجھتی
بھڑک اُٹھی ہے جو آگ اب تری لگائی ہوئی
جگا دیا تھا جسے تیرے اک تبسم نے
وہ آرزو مری راتوں کی نیند لے بیٹھی
فریب بادہ و ساغر بھی جس پہ چل نہ سکا
جو بارِ شاہد و نغمہ سے بھی تو دَب نہ سکی
تسلیاں جسے آسودگی نہ دے پائیں
جو ہائے اب کسی پہلو سکوں نہیں لیتیں
جگائے جاتی ہے، پیہم جگائے جاتی ہے
خدا گواہ ہے کل سے پلک نہیں جھپکی

نظموں کے علاوہ ابن صفی نے جو غزلیں لکھی ہیں ان کا حسن اور ان کی طرح داری بھی نمایاں ہے۔ راجستھان کے یگانہؔ ایم اے نے اپنے تعزیتی خط میں ابن صفی کا ایک مقطع نقل کیا ہے جو انہوں نے ان کی آٹوگراف بک پر لکھا تھا ۔

جو بوئے گل پہ نہ ہو اپنی دسترس اسرارؔ
چمن میں ایسی بھی پابندیوں سے کیا حاصل

یہ مقطع بجائے خود اتنا اشارہ ضرور دے رہا ہے کہ ان کے یہاں طنز و استعجاب اور استدراک و استفہام کا بھی اپنا ایک انداز ہے اور وہ بہرصورت فطری آزادی کے داعی ہیں۔ ''بازگشت'' کے نام سے ابن صفی (اسرارؔ ناروی) کا شعری مجموعہ ترتیب پایا تھا، لیکن وہ پکی روشنائی میں نہیں آسکا، پھر بھی ان کی غزلوں کا جو جستہ جستہ سرمایہ موجود ہے اس سے اس بات کا

بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک خاص تیور اور بانکپن ہے اور وہ نہ صرف صفائی بیان، دلکشی اور خیالات میں سادگی جیسے اوصاف رکھتی ہیں بلکہ جذبات میں بلندی، طبیعت میں دردمندی اور غم دوراں وغم جاناں کے حسن امتزاج سے بھی ان کے غزلیہ کلام کا انفراد روشن ہوتا ہے۔

ابن صفی کا دوسرا چہرہ ''طغرل فرغان'' کا چہرہ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین نثار بھی تھے اور انہیں طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھنے کا بھی بہت ہی خاص ملکہ تھا۔ وہ ماہنامہ رسالہ ''نکہت'' میں جس کے موسس عباس حسینی تھے، اپنے مذکورہ قلمی نام سے اپنی ایسی تحریروں کے جلوے دکھایا کرتے تھے جو بصورت طنزیات و مضحکات آج بھی تروتازہ ہیں۔ انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو مضامین طغرل فرغان کے قلمی نام سے لکھے جن میں ''دیوانے کی ڈائری''، ''ایک یادگار مشاعرہ''، ''سخن گراں''، ''لالوکھیت کا خلیفہ'' کے علاوہ ''قواعد اردو'' اور ''آب وفات'' خصوصیت سے مشہور ہیں، ان میں ''قواعد اردو'' بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کتاب کی اور ''آب وفات'' مولانا محمد حسین آزاد کے ''آب حیات'' کی نہایت عمدہ نثری پیروڈی ہے۔

طغرل فرغان کے نام سے لکھی گئی، ابن صفی کی تحریریں ان کے رواں وشگفتہ اسلوب کی گواہی دیتی ہیں۔ بلاشبہ ابن صفی کے طنز وظرافت میں متوازن آمیزش بنائے رکھنے پر بخوبی قادر ہیں اور بسا اوقات ان کے یہاں انشائیہ کا ہلکا سا رنگ بھی جھلک جاتا ہے۔ ابن صفی نے ایک زمانہ میں ماہنامہ ''نئے افق'' کراچی کو اپنی ادارت عالیہ سے نوازا تھا اور جیسا کہ ذکر آچکا وہ ''نیا رُخ'' نامی رسالے کی نگرانی بھی کررہے تھے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے تو کیا مضائقہ کہ ابن صفی کا ایک اور چہرہ ''صحافی'' کا چہرہ بھی ہے۔ البتہ یہ بات دوسری ہے اُن کا جو چہرہ ان کی عمر دوام وشہرت سرمدی کا ضامن بنا، وہ ''ابن صفی بی اے'' ہی کا چہرہ ہے جو تقریباً تین سو (یا جامع اردو انسائیکلوپیڈیا میں بتائی گئی تعداد کے بموجب ۲۴۲) ناولوں کے ہالے میں چمک رہا ہے۔

جاسوسی ناولوں کے زمانہ تخلیق کے لحاظ سے دیکھیں تو ابن صفی کی تحریری زندگی محض اٹھائیس برسوں پر محیط ہے۔ انہوں نے الہ آباد میں رہتے ہوئے صرف سات ناول لکھے اس کے بعد اگست ۱۹۵۴ء میں وہ کراچی چلے گئے اور وہاں ۱۹۵۶ء سے انہوں نے ''عمران سیریز'' کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ابتدائی سات ناولوں کے علاوہ اُن کے بقیہ سبھی ناول سرحد پار ہجرت کے بعد لکھے گئے، مگر ان کی اشاعت علیٰ حالہٖ ہندوستان میں بھی ہوتی رہی اور اپنی مقبولیت کے گراف بڑھاتی رہی۔

انگریزی سے متاثرہ ابتدائی سات یا آٹھ ناولوں کے علاوہ اُن کے طبعزاد جاسوسی ناولوں کی تعداد، جیسا کہ ذکر آچکا، تین سو کے آس پاس پہنچتی ہے۔ ان میں ''موروثی ہوس''، ''علامہ وہشت ناک''، ''انوکھے رقاص''، ''پرچھائیاں''، ''پرچھائیوں کے حملے''، ''سایوں کا ٹکراؤ''، ''ہمزاد کا مسکن''، ''چاندی کا دھواں''، ''قاتل سنگریزے''، ''صحرائی دیوانہ''، ''سانپوں کا مسیحا''، ''روشن ہیولیٰ''، ''بزدل سورما''، ''دست قضا''، ''عقابوں کے حملے''، ''ڈیڑھ متوالے''، ''شفق کے پجاری''، ''ٹھنڈا سورج''، ''خطرناک انگلیاں''، ''رات کا بھکاری''، ''بے گناہ مجرم''، ''جونک کی واپسی''، ''چیختی روحیں''، ''طلسمات کا دیوتا''، ''موت کی چٹان''، ''خطرناک جواری'' اور ''تین سنکی'' وغیرہ خاص طور سے مشہور ہیں، لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ محض چند صفحات کے مضمون میں نہ تو ابن صفی کے تمام تر کیا بیشتر ناولوں کا بھی چند سطری تذکرہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ البتہ یہاں میں مذکورہ فہرست کے دو ناولوں کا ہلکا سا ذکر کرنا چاہوں گی، ایک تو ''علامہ دہشت ناک'' ہے۔ ناول کا یہ ٹائٹل کردار اصلاً ایک نفسیاتی کردار ہے جو لاشعوری کیفیت میں جیتا ہے اور آخر میں جب اسی طرح کے ایک حادثہ سے دوچار ہوکر اس کی یادداشت لوٹتی ہے تو وہ آٹھ دس سال کا بچہ بن جاتا ہے اور دوسرا ناول ''ڈیڑھ متوالے'' ہے جس کی تاریخ اشاعت ۲۵ نومبر ۱۹۶۴ء ہے۔ اس ناول کا خاص پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں ابن صفی پر نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا تھا اور وہ تین سال تک کچھ نہیں لکھ سکے تھے اور پھر ۱۹۶۳ء میں صحت یابی کے بعد انہوں نے جو پہلا ناول لکھا تھا وہ یہی ''ڈیڑھ متوالے'' تھا۔

آج یہ پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ اُس زمانے میں ابن صفی کے ناولوں کا کیسا کریز تھا۔ اس ناول کے پہلے ایڈیشن کا اجرا

آنجہانی لال بہادر شاستری کے ہاتھوں ہوا تھا اور محض ایک ہفتہ کے بعد اس کے دوسرے ایڈیشن کا اجرا، اتر پردیش کے صوبائی وزیر قانون علی ظہیر نے کیا تھا۔ یہ ابن صفی کا وہ یادگار ناول ہے جس کی کاپیاں کہا جاتا ہے کہ ہزاروں نہیں، لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی تھیں۔

تاریخی، رومانی، سماجی، طلسماتی اور دیگر نوعیت کے ناولوں کی طرح جاسوسی ناول لکھنے کے بھی اپنے کچھ خاص اصول وآداب اور حدود ومقادیر ہوا کرتے ہیں۔ یہاں ''سریت'' کا معاملہ تو اصل الاصول کا درجہ رکھتا ہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ فنی لحاظ سے واقعہ، پلاٹ، کردار اور مکالمے ومناظر وغیرہ کی پیش کش بھی بنیادی اہمیت کی حامل اور خاص شعور و احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے اور ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کا مختصر سے مختصر ذخیرہ بھی یہ بتا دینے سے قاصر نہیں کہ انہوں نے اس راہ میں اپنی صلاحیتوں کے کیسے کیسے انمول جوہر دکھائے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابن صفی بڑی بڑی اور اونچی اونچی ڈگریاں نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے پاس جتنی ڈگری تھی، اتنی ڈگری رکھنے والے تو آج گویا ہر گلی کوچے میں مل سکتے ہیں، لیکن سند اور صلاحیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ابن صفی شاعری، ادب، تاریخ، فلسفہ، عمرانیات ونفسیات، جنسیات وسیاسیات اور سائنسی وریاضی سے بے پناہ وقوف رکھنے والے آدمی تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جاسوسی ناولوں سے صرف اپنا پیشہ ورانہ یا شوقیہ رشتہ نہیں رکھا بلکہ اس کے لئے اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں سے ہمیشہ ہی پوری توجہ کے ساتھ کام لیتے رہے۔

ان کے ناولوں سے کردار نگاری میں ان کی مشاقی کے احوال دیکھ کر واقعی انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ کرنل فریدی، کیپٹن حمید، انور، رشیدہ، قاسم، کیپٹن فیاض، علی عمران، ایکس ٹو، بلیک زیرو، صفدر سعید، جولیانا روشی، جوزف آصف، رحمان صاحب، سر سلطان، صفدر، تنویر، آصف ـــــ یہ سارے کردار ابن صفی کے ناولوں میں موجود ہیں، پھر مجرموں کی طرف دیکھئے تو ڈاکٹر ڈریڈ، فنچ، بوغا، ڈاکٹر سلمان، ناتونہ، تھریسیا بمل، بوہیما، انگاسے، لیونارڈ، رانا پرمود اور علامہ دہشت ناک، سنگ ہی غرض کہ قطار، در قطار طرح طرح کے مجرم، اپنی شاطرانہ فطرت اور مجرمانہ سرگرمیوں کے ساتھ کھڑے نظر ہیں، مگر خاص بات یہ ہے کہ ان کی اپنی اپنی پہچان اور اپنی اپنی تگ ودو ہے جو عموماً انہیں ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہونے دیتی۔ یہاں کرداروں کے نام کا انتخاب یہ بھی بتا دیتا ہے کہ نہ تو مجرموں کا کوئی ملک و مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی ملک وقوم، امن وفلاح اور آئین وقانون کی پاسداری کے لئے انہیں پہچاننے، پکڑنے اور ناکام بنا دینے والوں کی کوئی زبان، ان کا کوئی عقیدہ اور علاقہ ہوتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کا مطالعہ رکھنے والوں کے لئے یہ لکھنا یقیناً کچھ داخل انکشاف نہیں ہے کہ ان کے ناولوں میں ''فریدی'' ایک سنجیدہ، متین وذہین، طاقت ور اور پروقار کردار کی حیثیت سے اور ''عمران'' شریز ہنگامہ پرور اور چالاک کردار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور دیگر کردار معاون کردار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں میں کرداروں کے باہمی مکالمے سے ذہنی دباؤ کو کم کرتے رہنے کی جو صورتیں اُجاگر ہوتی ہیں وہ بھی قابل لحاظ ہیں۔ الفاظ، خیال اور خورد ونوش یا بعض معمولات اور واقعات سے ناول میں طنز ومزاح اور دلچسپی کا سامان جگہ جگہ رکھ دیا گیا ہے، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ جاسوسی کے اصل مقصد پر تفریح وترنگ اور ہنسی مذاق کو سچ مچ غالب نہ ہونے دے۔

ابن صفی کے ناولوں میں نفسیاتی الجھن، جنسی ناآسودگی ومحرومی اور مجرمانہ ذہنیت پر کاری ضرب لگانے اور مجرموں کو پہچان لینے اور ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے ہضم وصبر اور ہوشیاری واحتیاط کے ساتھ وقت کا انتظار رکھنے کا طریق وہنر بار بار حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اصل مجرم تک پہنچنے کی راہ میں اگرچہ متشابہات کی فوج در فوج بار بار، قطار در قطار کھڑی ہوتی ہے اور کبھی کبھی گمراہ کر دینے کے بالکل قریب بھی لے آتی ہے، لیکن سراغ رسانی کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ گمراہ نہیں کر پاتی ہے اور اصل مجرم پورے ثبوت کے ساتھ گرفت میں آجاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ کہیں کہیں بالکل آخر وقت میں عمران جیسے کردار کو ناکامی بھی ملتی ہے اور مجرم اس کی گرفت میں آتے آتے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، لیکن یہ مجرم کی وقتی فتح ہوتی ہے جس کا جرم کی دائمی فتح سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اسی طرح کبھی کبھی عمران جیسا کردار یا اس کے معاون کرداروں میں سے کوئی ایک سخت مشکل میں بھی گھر جاتا ہے اور

قاری کوایسا لگتا ہے کہ اب اس کے جان کے لالے پڑ ہی جائیں گے اور اس کا قصہ تمام ہوجانے کی خبر ہی پڑھنے کو ملے گی، مگر جب اس کے برعکس منظر نامہ سامنے آتا ہے تو بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اتفاقات کا زائیدہ نہیں، بلکہ ذہانتوں کا اور تفتیشی حکمت عملی کا زائیدہ بن کر سامنے آتا ہے اور فضا کو حیرت زا بنا دیتا ہے۔

ابن صفی کا یقیناً یہ بڑا امتیاز ہے کہ کس خاص اور شعوری انتخاب کے بغیر بھی اگر اُن کے دو چار ناول اٹھالئے جائیں اور ان کا سرسری مطالعہ کیا جائے تو ان کے گونا گوں انفرادی رنگ وآہنگ نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''دیو پیکر درندہ'' سامنے آتا ہے تو اس میں ایسے انوکھے واقعات اور کرداروں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جو دیر تک ہمارے اذہان کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس میں واقعہ کی عجیب وغریب نوعیت ابتدا سے ہی ہمیں چونکاتی ہے بلکہ آخر آخر تک ہماری حیرت اور دلچسپی کو بڑھاتی چلی جاتی ہے اور ہم تحیر کی سوغات اور ہنسی کی برسات سے مسلسل لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ ناول ''بیمبوکیسل'' پڑھنے کو ملتا ہے تو اس میں اٹلی کی سرزمین پر انجام دیا جانے والا عمران کا کارنامہ ہمیں حیرت واستعجاب کے سمندر میں ڈبونے لگتا ہے۔ ''چیختی روحیں'' میں ایک طرف عمران اور بوغا کا زبردست ٹکراؤ دیکھنے کو ملتا ہے تو دوسری طرف یہ وصف بھی کہ نہ تو واقعات کا الجھاؤ کہیں دلچسپی میں کمی آنے دیتا ہے اور نہ ہی کرید اور تجسس کا طلسم کہیں ٹوٹ پاتا ہے۔ ''خطرناک جواری'' کی کہانی ''بوغا سیریز'' کی سنسنی خیز کہانی ہے جس میں مصر کا ماحول دکھایا گیا ہے، مگر خاص بات یہی ہے کہ اس ماحول نے ناول کے دلکش انداز میں سرمو فرق نہیں آنے دیا ہے۔ ناول

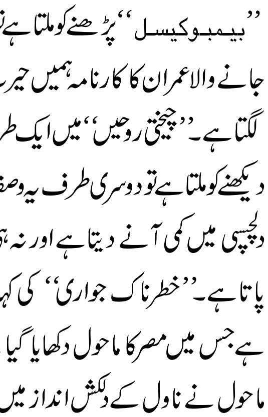

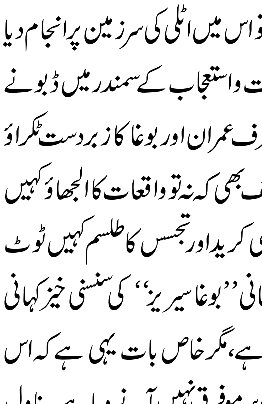

''رات کا بھکاری'' اگر ایک نئے طرز سے ناول نگار کی اُپج اور ذہانت کا معترف بناتا ہے اور ہم قدم قدم پر حیرت انگیز واقعات کے روبرو ہوتے چلے جاتے ہیں تو ناول ''آوارہ شہزادہ'' بھی ہمیں شروع سے آخر تک اپنی مٹھی میں لئے رہتا ہے اور جاسوسی کے عکس آوارگی کے اصل رنگ بالآخر دکھا ہی جاتے ہیں۔ ناول ''چارشکاری'' کا اختصاص اگر اس پہلو سے لائق ذکر ہے کہ یہاں اپنی تمام تر ذہانتوں کے باوجود حمید مجرموں کے خیمہ میں ہی نہیں جا پڑتا ہے بلکہ حالات اس کی حیثیت کو کافی مشکوک بھی بنا دیتے ہیں اور پھر حمید کی حیرت انگیز صلاحیت اُسے رستگاری دلاتی ہے تو ابن صفی کے ناول ''تصویر کی موت'' میں بھی جدت پسندی اور انوکھے طرز فکر کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس ناول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عمران اور ڈائرکٹر جنرل رحمان صاحب دونوں نے ایک ساتھ کام کیا ہے اور باپ بیٹے کی جھڑپ اور پدرانہ شفقت کے احوال بھی جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں چند ناولوں کے بارے میں یہ چند سطریں محض ''گلی از گلزار'' کے مصداق لکھ رہی ہوں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی کے ناول ادبیت اور تجسس کاری کے لحاظ سے ایک ایسا صحیفہ درصحیفہ کہلانے کے سزاوار ہیں کہ انہیں جہاں سے بھی اُٹھالیا جائے اور جہاں تک بھی پڑھ لیا جائے، ان کے فن کا آفتاب کہیں جھکتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔

ابن صفی کے ناول میں انفرادی مجرموں سے بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے اور ایسے گروہی مجرموں سے بھی کہ جب وہ سامنے آتے ہیں تو نہ جانے کیسی کیسی بین الاقوامی سازشیں بے نقاب ہوجاتی ہیں۔

جاسوسی ناولوں کی دنیا یقینی طور پر عام ناولوں سے مختلف ہوتی ہے۔ ایسے ناول چاہے تھوڑی دیر کے لئے مہماتی یا جنگی اور رزمیہ کہہ دئے جائیں، مگر ظاہر ہے کہ ان کی بنیادی نوعیت، ان کی فضا اور اُن میں نبرد آزمائی اور طاقت آزمائی کا ایک الگ ہی رنگ ہوتا ہے۔ یہاں جو ہفت خواں طے ہوا کرتے ہیں، وہ مافوق فطرت انداز سے نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق ذہنی اور ترقی یافتہ مادی وسائل اور مضبوط تنظیمی اور عقبی زمین سے ہوا کرتا ہے اور پھر ملاقاتوں اور باتوں کا ماحول بھی کچھ خاص رہتا ہے۔ مذکورہ زاویوں سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابن صفی نے جو جاسوسی ناول لکھے ہیں ان میں مختلف قسم کے خصائص موجود ہیں۔

مثال کے طور پر ان کے یہاں منفی کرداروں کو جاندار بنانے کا ہنر اپنے عروج پر ہے اور اتفاقی واقعات سے مدد لینے میں عدم دلچسپی اور دوری کے شواہد بھی موجود ہیں۔

ابن صفی کے ناولوں کی بنت بھی رنگارنگ ہے، ان کے بعض ناول جیسے ''چیختے دریچے'' اور ''خطرناک دشمن'' ایک سوچ پر ختم ہوتے ہیں اور ایک قسم کی مماثلت دکھا جاتے ہیں تو ان کے ناول ''اندھیرے کا شہنشاہ'' اور ''چالیس ایک باون'' میں سراغ رسانی کا معکوسی انداز دیکھا جاسکتا ہے، پھر جہاں تک جاسوسی آلات اور سائنسی ایجادات سے کام لینے کا معاملہ ہے، اس کے لئے ان کا ناول ''جنگل کی آگ'' ہی سامنے رکھ لینا شاید کہ بہت کافی ہے۔ ان کے ناولوں میں سولر مائیکروچپ، ٹائم مشین، خلائی سفر، لیزرگن، ہیومینائٹ روبوٹ اور طرح طرح کے انوکھے جراثیمی ہتھیار اور ان کے حیرت انگیز انقلابی تجربات واثرات کا ایک جہاں موقع بہ موقع آباد دکھائی دیتا ہے۔

یہ غلط نہیں کہ جاسوسی دنیا میں کام آنے والے خاص خاص ٹولس کے ذکر کی وجہ سے بسا اوقات ابن صفی کے ناول میں کچھ اجنبی پن بھی آنے لگتا ہے اور ناول نگار جب بہت ساری باتوں کو پڑھنے والوں کے معہود ذہنی پر چھوڑ دیتا ہے تو دلچسپی کے عناصر کسی حد تک گھٹتے ہوئے بھی محسوس ہونے لگتے ہیں، مگر اصلاً یہ معاملہ قاری کی اپنی اپنی افتاد طبع کا ہوتا ہے یا خاص اسپائی ٹولس کو لانے کی مجبوری کا معاملہ، ورنہ مجموعی طور پر ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی فنی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کا مطالعہ رکھنے والوں کے لئے یہ باتیں یقیناً نئی نہیں ہوسکتیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں ''شکرال''، ''ترانمال'' اور ''زیرولینڈ'' جیسے ملک ہی تخلیق نہیں کئے ہیں بلکہ ایک نئی زبان بھی بنائی ہے۔ ان کی اس زبان میں گھڑی کا بند ہونا ''گھڑی ٹاوچ'' ہونا ہے اور خوبصورت لڑکیاں ''فل فلوٹیاں'' ہیں۔ ان کی خودساختہ زبان میں بولنے والے کردار کے یہاں محبت ''محویت'' بن کر کانوں تک پہنچتی ہے اور ''ہوگا'' اور ''دیکھا''، ''ہوغا'' اور ''دیخا'' سنائی دیتا ہے اور یہ اصلاً سننے والوں کی سماعت کا نقص نہیں ہوتا بلکہ اس صوتی تبدیلی کا جلوہ ہوتا ہے جو کردار کی زبان اپنے تلفظ کی بدولت دکھا جاتی ہے۔ اس سے ایک طرح کا مزاح بھی ابھرتا ہے اور یہ کہنے کی وسیع گنجائش بھی مل جاتی ہے کہ ابن صفی خودساختہ الفاظ اور خاص ومضحک لب ولہجہ کی ایک نئی زبان سے بھی اپنے پڑھنے والوں کو نوازنے پر قادر ہیں۔

یہاں بات ان کے جاسوسی ناولوں کی ہو رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کرداروں کی گفتگو کے دوران جس طرح کسی خاص فلسفہ کو بیان کر دیا ہے یا شعر وادب کے کسی خاص مباحثاتی رُخ کو دکھا دیا ہے وہ بھی ان کے افادات واضافات میں داخل ہے۔

ہم ابن صفی کے اکثر ناولوں میں کرداروں کو کسی لائبریری میں کتابیں ڈھونڈتے ہوئے، انہیں غور سے پڑھتے ہوئے یا کوئی جغرافیائی نقشہ پھیلائے ہوئے اور اس پر نظر جمائے ہوئے دیکھتے ہیں جس سے نہایت خاموش انداز میں یہ پیغام بھی مل جاتا ہے کہ جاسوسی کی دنیا تازہ مطالعے اور معلومات سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

ظاہر ہے کہ ابن صفی ایک توانا قلم فن کار تھے جنسی لٹریچر کے مقابلے میں جاسوسی لٹریچر کو عوامی مقبولیت کی بلندی تک لے جانا کوئی معمولی کام نہ تھا، لیکن یہ کام کم وبیش تین دہائیوں تک انہوں نے جس خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا، اس میں ان کی ہمسری کے سوال کا جواب کل بھی عنقا تھا، آج بھی عنقا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کے ناولوں میں آنے والے کردار فوق البشر یا زاہد خشک ہیں بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ تمام تر مواقع، سہولیات اور امکانات وشہوات کے باوجود وہ مقصد پر نظر رکھنے والے اور اس کے مطابق نازک سے نازک ترین لمحوں میں بھی اپنے سرکش جذبات کی عنان مضبوطی سے تھام لینے والے کردار ہیں جنہیں ہم مقصد اور موقع کی کتھارسس سے آشنا کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔ وامق جونپوری نے ابن صفی پر اپنے مختصر تعزیتی مضمون میں بالکل درست لکھا ہے کہ:

> ''ابن صفی ایک جاسوسی ناول نگار ہی نہ تھے وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق ادیب اور فنکار تھے۔ وہ جاسوسی ادب میں بے پناہ تخلیقی صلاحیت کے حامل تھے۔ ان کا جاسوسی ناول دوسرے جاسوسی ناولوں سے مختلف ہوتا تھا، ان کے ناولوں میں ازابتدا تا انتہا پھیلی

منیر سیفی

Samanpura, Malik Lane, BVC, Patna - 800014 (Mob. 9835268274)

قطعاتِ تاریخ وفات ابن صفیؔ*

(پ:اِلہ آباد ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء و: کراچی ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء)

جس کو نہ سوچا کسی نے کبھی — کام وہ کر جاتے تھے ہرگانوی
موضوع اک ایسا ہی زیرِ غور تھا — تھے فقید المثل جو ابن صفی
بعد از سالِ چہل تاریخ گفت — ''مستقر آں عالم برزخ صفی''
۸۰ ء ۱۹

مانا ہر شے ہے جہاں کی منتفی — پھر بھی اپنے شغل میں گم ہر کوئی
زندگی نے دفعتاً دھوکا دیا — ''ہائے رخصت ہو گئے ابن'' صفی
۰۰ ھ ۱۴

''واہ! ناول میں جو کو کلتاش تھے'' — کرۂ ارض اور ہفت آکاش تھے
۰۰ ھ ۱۴
مل گئی تھی ان کو جادو کی چھڑی — تـابعیں گنگار اور حراش تھے

رات سے کالی ہے صبح صادق افسوس — طلوع آج بھی ہوا نہیں طارقِ افسوس
خوف نما دلچسپ خزانہ لاتا تھا — بحر سیہ کا تھا جو ، وہ غارق افسوس

ہوئی طنز ومزاح کے قہقموں اور پھلجھڑیوں کی ایک جھالر ملتی ہے۔ان کے مکالموں میں بڑی آمد اور برجستگی ہوتی ہے۔ انہوں نے فریدی، حمید، قاسم اور عمران جیسے جاسوسی کردار چھوڑے جو شرلاک ہومس اور ڈاکٹر واٹسن کی طرح جاسوسی ناولوں کی تاریخ میں کبھی فراموش نہ کئے جاسکیں گے اور لوگ ان کو مدتوں یاد رکھیں گے اور اس طرح ابن صفی کا نام بھی ہمیشہ لیا جائے گا۔ میں ان کے ناولوں کو سنجیدہ مطالعوں اور خون جلانے والے کاموں سے خالی اوقات میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ میں ہی کیا میرے علم میں ایسے بڑے ادیب اساتذہ اور سیاسی رہنما بھی ہیں اور تھے جو ابن صفی کے ناولوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔تفریح دماغی ہو یا جسمانی صحت کے لئے ضروری ہے اور ابن صفی کے ناولوں کا شمار گھر بیٹھے اچھی تفریحوں میں کیا جاسکتا ہے۔البتہ ابن صفی کے ناول اس نہج سے خطرناک کہے جاسکتے ہیں کہ ان کی زبان وبیان کی جاذبیت اور کرداروں کی دلچسپ گفتگو

کر کے گیا بے لطف ہمارے روز و شب
جاسوسی ناول کا وہ خالق افسوس
ابن صفی کے نام پہ خوب کماتے تھے
جعلی ناول لکھ لکھ کر سارق افسوس
''صحت بخش'' ٹانک جاسوسی ناول تھا
۱۴۰۰ھ
''دل و دماغ ان سے تھا سدا بارق'' افسوس
۱۹۸۰ء

شنبہ تیرہ رمضاں چودہ سو ہجری
جولائی ۲۶ویں انیس سو اسی
مذکورہ تاریخ کو ہے ہے جدا ہوا
''وہ شہرہ آفاق رائیٹر ابن صفی''
۱۹۸۰ء

چشمہ آتش فشاں (☆)، قاموس (☆) بھی
تھے درندے آپ سے مانوس بھی
''گرد باد'' (☆)، ''ابرو کی جنبش'' (☆) کا غلام
خوش ''زبانِ شمع'' (☆) سے فانوس بھی
ہند و پاک و دیش بنگلہ ہی نہیں
''خونی پنجہ'' (☆) میں تھے چین و روس بھی

شہر و صحرا گاؤں اور چوپال کی
ہر خبر آکاش اور پاتال کی
ان کے ناول میں ہر اک تصویر تھی
ماضی، مستقبل اور سیفی حال کی

❁❁❁

* پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (مرحوم) کی تحریک پر لکھے گئے قطعاتِ وفات ☆ ابن صفی کے ناولوں کے نام

حرکات قاری کو اِڈکشن کی سرحد تک پہنچا دیتے ہیں۔ ابن صفی ایک بے تکان لکھنے والے تھے۔ انہوں نے کئی سو ناول لکھے جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور یہ کہ ان ناولوں کی مجموعی طور سے کئی لاکھ جلدیں پڑھنے والوں میں گردش کرتی رہی ہیں اور مدتوں کرتی رہیں گی۔''

(جاسوسی دنیا، الہ آباد ۱۹۸۰ء، ص ۱۴)

ابن صفی صرف دولت بٹورنے کی خاطر یا رسماً عوامی تفریح کے لئے ناول نہیں لکھ رہے تھے بلکہ خود ان کے قول کے مطابق، جیسا کہ ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' (ج ا ص ۲۴) کے نوشتہ میں درج ہے:

''ان کے ناولوں کا مقصد تھکے ہوئے ذہنوں کو تفریح مہیا کرنا اور انہیں قانون کا احترام کرنا سکھانا ہے، ابن صفی اپنے کرداروں کو جنس سے دور رکھتے ہیں اور انہیں انسانی قدروں کا امین بنا کر پیش کرتے ہیں۔ سسپنس، مزاح، شکست جرم ان کے ناولوں کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مزاحیہ جملوں کے ذریعہ وہ جاسوسی ناول کی گمبھیرتا کو محدود کرتے ہیں۔ سادہ، سہل، بامحاورہ اور شگفتہ زبان ان کے ناولوں میں ملتی ہے۔ ان کے ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ لاکھوں کی تعداد میں چھپے اور بعض لوگوں نے ابن صفی کے ناول پڑھنے کی غرض سے اردو زبان سیکھی۔''

درج بالا اقتباس کی آخری سطروں میں اگر محض جھوٹ اور مبالغہ نہیں ہے تو اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں جاسوسی ادب کی تخلیق کے حوالے سے یہ رتبہ بلند جس کو ملا مل گیا۔

❁❁❁

طغرل فرغان

ایک یادگار مشاعرہ

اردو مڈل میں فیل ہونے کے بعد میں نے پان بیڑی سگریٹ کی چھوٹی سی دوکان رکھ لی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آج کل ایم۔اے، بی۔اے پاس لوگوں سے کوئی جوتے میں پالش بھی نہیں کرواتا یا یہ سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ اپنی نامعقولیت کی بنا پر خود نہیں کرتے، لہٰذا میں نے سوچا کہ مڈل پاس کرنے میں جتنا عرصہ لگے گا، اتنے دنوں میں کم ازکم میں اپنے پیروں پر تو ضرور کھڑا ہو جاؤں گا اور پھر اگر میں نے مڈل پاس بھی کرلیا تو کون سا بڑا تیر ماروں گا، جب کہ اچھے اچھے پڑھے لکھوں سے لوگ کہہ بیٹھتے ہیں ع

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

اور مجھے نکتہ چینیوں سے یوں بھی انتہائی نفرت ہے، اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تجارت ہی کی جائے۔ ابھی تین ہی ماہ تجارت کی تھی کہ ایک اچانک حادثہ کے تحت شادی بھی کرنی پڑی اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میری بیوی کو جہیز میں ایک بھینس ملی۔ یہ عمارت جو آپ دیکھ رہے ہیں نا یہ اسی بھینس نے بنوائی ہے۔ آپ تعجب کریں گے، لیکن میں آپ سے حلفیہ کہتا ہوں ـــــ سنئے! ہوا یوں کہ میں نے پان بیڑی کے ساتھ ہی ساتھ دودھ بھی بیچنا شروع کر دیا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دودھ کی تجارت بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا اور آج تو خیر سے کئی شہروں میں میری ڈیریاں ہیں۔ میں نے جنگ کے زمانے میں دل کھول کر چندہ دیا۔ اس لئے سرکار انگلیشیہ کے حضور سے مجھے ۱۹۴۵ء میں شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔

اس شہر کے کئی یتیم خانوں اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی کر رہا ہوں۔ کئی بار متعدد جلسوں کی صدارت بھی کر چکا ہوں اور اب بھی جب موقع ملتا ہے، صدارت سے باز نہیں آتا۔

آج صبح جب میں دفتر میں بیٹھا حساب کر رہا تھا، دو تین حضرات ایک مشاعرے کی صدارت کا دعوت نامہ لے کر آئے۔ کسی مشاعرے کی صدارت کرنے کا میرے لئے یہ پہلا موقع تھا، لہٰذا میں نے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

''اس مشاعرے کی غرض قومی خدمت ہے۔''

ایک صاحب بولے۔

''اور آپ جیسا قوم کا ہمدرد ہمیں اس زمانے میں تو کوئی اور نظر نہیں آتا۔'' دوسرے نے کہا۔

''اسی لئے ہم بنارس جیسے دور دراز مقام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔'' تیسرے صاحب بولے۔

''یہ مشاعرہ دراصل چندے سے ہو رہا ہے۔'' تیسرے صاحب جیب سے رسید بک نکال کر اس پر کچھ لکھتے ہوئے بولے۔

''مشاعرے کی آمدنی سے ایک مرغی خانہ کھولا جائے گا اور مرغی خانے کی آمدنی سے ایک یتیم خانہ اور یتیم خانے میں قوم کے لاوارث بچے......''

انہوں نے رسید کاٹ کہ میری طرف بڑھا دی۔

''مگر......مگر......'' میں پانچ سو کی رقم دیکھ کر ہکلایا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ قلیل رقم آپ کے شایانِ شان نہیں ......لیکن ہم اس سے زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتے۔'' تیسرے صاحب رسید بک لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے بولے۔

کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے چیک بک نکال کر پانچ سو کا چیک کاٹ دیا۔

''شکریہ'' ایک نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی ۱۵ر دسمبر کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔''

اُن لوگوں کے جاتے ہی میں سوچنے لگا۔ پانچ سو روپے میں

یہ صدارت کچھ زیادہ مہنگی نہیں پڑی اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ بنارس کی پبلک بھی مجھ سے واقف ہو جائے گی۔

اُن کی دیکھا دیکھی اور دوسرے شہروں کے لوگ بھی مجھے مدعو کرنے لگیں گے اور پھر......اور پھر......مگر مشاعرے میں شاید مجھے خطبہ صدارت بھی پڑھنا پڑے۔ پندرہ دسمبر کو ابھی دس روز باقی ہیں اتنے عرصے میں خطبہ لکھا اور رٹا جاسکتا ہے۔ میں نے حساب کا رجسٹر ایک طرف رکھ کر خطبہ صدارت لکھنا شروع کر دیا۔

''حاضرین و حاضرات و بانیان مشاعرہ......! آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے صدر بنا دیا۔''

لیکن یہ تو درست نہیں اس میں تھوڑی سی خاکساری بھی ہونی چاہئے، لہٰذا میں نے اسے کاٹ کر دوسری سطر لکھنی شروع کی۔

''حاضرین و حاضرات و بانیان مشاعرہ......! آپ نے مجھ جیسے گھامڑ آدمی کو صدر بنا کر انتہائی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ اس وقت مجھے مولوی محمد غالبؔ علی کا شعر یاد آرہا ہے ؎

کعبہ کس منھ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالبؔ علی صاحب بہت بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے اتنے بڑے کہ کتنا بڑا کہا جائے۔ ایک بار وہ سہارنپور سے فتح محمد پور جا رہے تھے۔ راستہ میں انہیں ایک اللہ والے بزرگ ملے اور انہوں نے ان کو کچھ جڑی بوٹی کھلا دی، پھر وہ بہت بڑے شاعر ہو گئے۔ اللہ والوں کا کیا کہنا، ہمارے محلے میں بھی ایک مرد بزرگ رہتے ہیں۔ اولاد والوں کو بے اولاد کر دیتے ہیں۔ آنکھ والوں کو نابینا اور تندرست کو مجبور لاچار کر دیتے ہیں۔ میرے چھوٹے لڑکے کو بہت چاہتے ہیں۔ اس کو دلار میں بگوا کہتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں بہت دلچسپی ہے۔ آج کل انہیں بخار آرہا ہے، ورنہ میں اُن کو اپنے ہمراہ ضرور لاتا۔

میں آپ سے قسمیہ کہتا ہوں کہ میں بہت نالائق آدمی ہوں، بڑا چغد ہوں۔ آپ نے خوامخواہ مجھے صدر بنا دیا، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے شعر و شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ لکھنؤ کی منی جان ہیں نا انہوں نے صرف میرے لئے بہت سی غزلیں یاد کر رکھی ہیں۔

آپ نے شاید منی جان کو گاتے نہیں سنا۔ واللہ غضب کی چیز ہے۔ کیا گلا پایا ہے، کبھی لکھنؤ آیئے تو مجرا سنواؤں گا۔''

یہاں تک لکھنے کے بعد میں سوچنے لگا کہ تقریر میں موقع موقع سے کچھ اشعار بھی ہونے چاہئیں۔ لہٰذا میں نے تقریر کو فوراً ہی سنبھال لیا اور لکھنا شروع کیا:

''بھائیو! مجھے یہ شعر بہت پسند ہے ؎

آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھو کبھو
نکلیں ہمارے دل کے بھی ارماں کبھو کبھو

ایک بار منی جان اس شعر کو گا رہی تھی۔ سماں بندھا ہوا تھا کہ اچانک میں وہاں پہنچ گیا، جس وقت اس نے ''کبھو کبھو'' کی تکرار شروع کی مجھے خون کی قے ہو گئی اور عرصہ تک پیچش میں مبتلا رہا۔ اب بفضلہٖ بالکل ٹھیک ہوں، لیکن ابھی قدرے نقاہت باقی ہے۔ اگر مر جاتا تو یہی ہوتا ؎

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے

شہید ناز۔ اُف۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ آغا حشر کمپنی نے ایک ڈرامہ ''شہید ناز'' کھیلا تھا۔ صاحب مجھے تو بہت پسند آیا تھا۔ کچھ نہیں تو ساٹھ بار ضرور میں نے اس کھیل کو دیکھا ہوگا۔ اس میں ایک لڑکی کام کرتی تھی۔ اس کا نام گل خیرو تھا۔

ہائے ہائے کیا چیز تھی وہ......گل خیرو ایک دوا کا بھی نام ہے جو بواسیر کے لئے اکسیر ہے۔ بواسیر چاہے خونی ہو چاہے بادی گل خیرو کو اُبال کر چالیس دن صبح شام پی لیجئے، خدا نے چاہا تو بالکل آرام ہو جائے گا۔ یہ ایک فقیر کا بخشا ہوا نسخہ ہے، میں نے کہیں پڑھا ہے کہ اردو کے بہت بڑے شاعر محمد غالب علی صاحب کے پاس ''برہان قاطع'' کے کئی نسخے تھے، لیکن میری سمجھ میں آج تک نہ آسکا یہ ''برہان قاطع'' کون سی بیماری ہے۔ ممکن ہے پرانے زمانے میں رہی ہو، اب نہ ہوتی ہو......کون جانے۔

میں ایک بار آپ سے پھر کہوں گا کہ آپ نے مجھ جیسے اُلو کے پٹھے کو ناحق صدر بنا دیا۔

خیر اب آپ نے مجھے اس لائق سمجھا ہے تو میں خدا کو

حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ہر ماہ ایک مشاعرہ کیا کروں گا، لیکن میں ایک بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ لوگ مشاعرے میں بہت زیادہ ''واہ واہ'' نہ کیا کیجئے۔

جب کوئی شعر پڑھتا ہے اور آپ لوگ ''واہ واہ'' کرنے لگتے ہیں تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ایک کتا کسی اونچی جگہ پر بیٹھا بھونک رہا ہو اور مجمع نیچے سے ''دت دت'' کر رہا ہو، اس لئے آپ واہ واہ نہ کیا کیجئے۔

ایک بات اور......! مجھے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے کہ ہمارے شعرائے کرام اپنی صحت کی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ چائے، شراب اور سگریٹ کثرت سے پیتے ہیں۔ اگر ان چیزوں کے بجائے وہ خالص دودھ اور تازہ مکھن استعمال کریں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ان کی شاعری کہیں کی کہیں جا پہنچے۔

میں آپ سے قسمیہ کہتا ہوں بلکہ حلف اُٹھانے پر تیار ہوں کہ میری ڈیریوں میں آپ ہمیشہ خالص دودھ اور خالص مکھن پائیں گے۔ آپ کے شہر میں بھی میری ایک ڈیری ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آزمائش کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

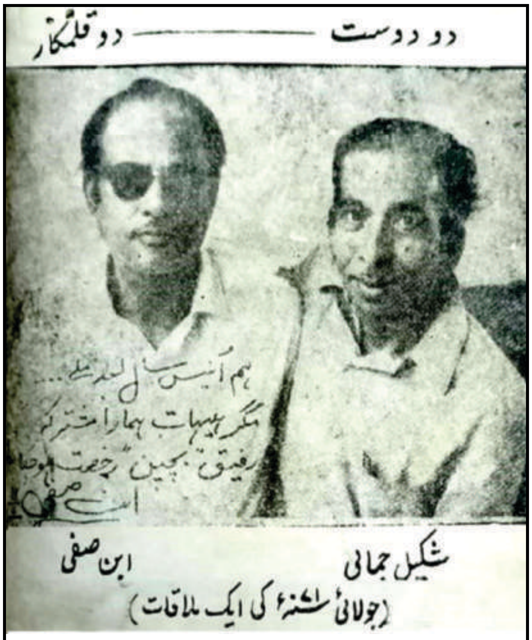

ایک یادگار تصویر بشکریہ جاسوسی دنیا ۱۹۸۰ء

میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرون گا کہ آپ نے مجھ جیسے نالائق اور جانگلو کو اپنے مشاعرے کی صدارت کے قابل سمجھا۔ اب مشاعرے کی کارروائی شروع ہوتی ہے، اس لئے ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خطبہ صدارت لکھ چکنے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ۱۶ر دسمبر کو مشاعرہ تھا۔ ۱۴ر دسمبر تک میری یہ حالت ہوگئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے مجھ سے خوف کھانے لگے۔ ہوا یہ کہ ایک دن ایک بچے نے مجھے تنہائی میں قدآدم آئینے کے سامنے خطبہ صدارت دہراتے دیکھ لیا۔ اس کے بعد ہی مجھے ایک عرصہ کے لئے بچوں سے نجات مل گئی۔

۱۶ر دسمبر کی رات کو میں بنارس پہنچا، حالانکہ ابھی مشاعرہ شروع ہونے میں کافی دیر تھی، لیکن پنڈال میں تل رکھنے کو بھی جگہ نہ رہ گئی تھی۔ سکریٹری صاحب نے آہستہ سے میرے کان میں کہا:

''یہ بنارس کی تاریخ میں غالباً پہلا کامیاب مشاعرہ ہوگا۔''

''اچھا......'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہ محض آپ کی صدارت کی وجہ سے...... ورنہ پچھلے سال بھی ہم نے مشاعرہ کیا تھا۔''

''ارے...... بھلا میں کیا......ہی ہی ہی ہی......''

''نہیں واللہ یہ محض آپ کے نام کی جادو اثری ہے اور پھر آج کون ہے جو دنیائے ادب میں آپ سے آنکھیں چار کر سکے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اردو محض آپ کی وجہ سے زندہ ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اگر آپ کی ہستی نہ ہوتی تو ہم یہ مشاعرہ کبھی نہ کر سکتے حالانکہ تین سو کا گھاٹا......''

''گھاٹے کی آپ پرواہ نہ کیجئے۔'' میں نے جوش سے کہا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ تھوڑی دیر تک مقامی شعرا اور شوقین طلبا کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔ اس کے بعد میں نے خطبہ صدارت پڑھا اور مشاعرے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوگئی۔ دو شاعر پڑھ چکے تھے تیسرے کا نام پکارا ہی جا رہا تھا کہ ایک شور قیامت اُٹھا۔

وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوئی کہ پبلک کے دو پسندیدہ شاعر گیٹ پر اڑ گئے ہیں۔ کہتے ہیں جب تک سکریٹری نہیں آئیں گے

......سکریٹری...... ہوتا ہی اسی لئے ہے......مگران دونوں کوسنبھالنا اس اکیلے کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے کئی مناسب تدبیریں کی گئیں۔

بہزار خرابی دونوں حضرات جھومتے جھامتے آئے ان میں سے ایک صاحب نے جوتا اُتارنا مناسب نہ سمجھا اس لئے پیر پر پیر رکھ کر بیٹھ گئے۔ دوسرے حضرت مجھے گھورتے رہے......پھر اچانک سے انہوں نے جھک کر ادب سے مجھے سلام کیا اور اجازت لے کر میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

سکریٹری صاحب نے کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا:

''حضرات آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی آپ کے محبوب شعرا حضرت جہاؔز اور حضرت مجاؔل تشریف لے آئے ہیں۔اب مشاعرے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔''

سکریٹری صاحب کے اشارہ کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے بزرگ حضرت جہاؔز ہیں۔

مشاعرہ دوبارہ شروع ہوگیا۔

''صدر صاحب'' جہاز صاحب نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

''فرمایئے......''

''سلا مالیکم۔''

جہاؔز صاحب نے اپنی پیشانی پر پورا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''واعلیکم السلام'' میں نے اخلاقاً دانت نکال دیئے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جہاؔز صاحب پھر چونکے۔

''صدر صاحب'

''فرمایئے''

''سلا مالیکم''

''میں آج کی رات خود کو بیوہ محسوس کررہا ہوں۔''

میں نے پھر دانت نکال دیئے۔

آپ بھی ہنستے ہیں۔ میں آپ کو گولی ماروں گا......ٹائیں۔

جہاؔز صاحب نے بائیں ہاتھ کی کلمے کی انگلی پھیلا کر اور انگوٹھے میں دائیں ہاتھ کی کلمے کی انگلی پھنسا کر بندوق چلائی۔

''صدر صاحب''

''ہاں بھئی''

''ٹھائیں''

ایک شاعر پڑھ کر اُٹھ ہی رہا تھا کہ جہاؔز صاحب نے اسے بھی اپنی انگلیوں کی بندوق سے قید کردیا اور پھر یک بیک سارے مجمع پر گولیوں کی بوچھار کردی۔ جب انہیں اچھی طرح سے اطمینان ہوگیا کہ اب ایک بھی متنفس زندہ نہیں رہا تو وہ مجاؔل صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

''مجاؔل اے مجاؔل۔ جناب صدر میرے باپ کے والد ہیں۔''

کہہ کر جہاؔز صاحب میرے ہاتھ چومنے لگے اس کے بعد انہوں نے منھ چومنے کی کوشش کی تو میں بوکھلا کر وہاں سے نو دو گیارہ...... (ماخوذ از ''جاسوسی دنیا'' الہ آباد، ش۱۵۲، ص۲۶۳ تا ص۲۷۲) ❁❁

غزل

کبھی قاتل ، کبھی جینے کا چلن ہوتی ہے
ہائے کیا چیز ، یہ سینے کی جلن ہوتی ہے

چھیڑیئے قصہ اغیار ہی ، ہم سن لیں گے
کچھ تو کہیئے کہ خموشی سے گھٹن ہوتی ہے

یاد ماضی ہے کہ نیزے کی اَنی ، کیا کہیئے
ذہن میں ایسی چبھن ، ایسی چبھن ہوتی ہے

پھول کھلتے ہی چمن آنکھ سے اوجھل ہوکر
ڈھونڈتا ہے اُسے جو رشک چمن ہوتی ہے

کتنی ہی زہر میں ڈوبی ہوئی رکھتی ہو زباں
پھر بھی نازش گل ، غنچہ دہن ہوتی ہے

—— ابن صفی

افسانے

عشرت ظہیر
House No. 370 A, 4th Floor, Gali 6A, Zakir Nagar, Jamia Nagar,
New Delhi - 110025 (Mob. 9801527481)

احساس کے ویرانے میں

بجری کی لمبی شاہراہ کے آخری سرے پر ایک خوبصورت حویلی ایستادہ ہے، جو پرکھوں کی عنایت اور رواداری کی یادگار ہے۔ تعمیر نو اور تازہ رنگ و روغن کے باوجود حویلی کی دیوار اور محراب، لمبے چوڑے برآمدے اور صحن، ماضی کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی روایات اور عہد گم گشتہ کی کہانی دہراتے معلوم ہوتے ہیں۔

عالیشان حویلی تھی۔ زمین جائیداد کے قابل لحاظ سلسلے، آمدنی کی کوئی فکر نہ تھی۔ مرزا شطرنج کھیلتے، گپیں ہانکتے اور سیر و تفریح یا شکار کی دلچسپیوں میں مصروف ہوتے۔ گویا زندگی تھی، اس کی کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ زندگی کا لحاظ نہ موت کا کھٹکا۔ کوئی جستجو نہ تھی، کوئی تگ و دو نہ تھی۔

اچانک ندی کی طغیانی کی طرح حالات نے ایک نیا موڑ لیا۔ مرزا کا ایک دیرینہ دوست وہاں پہنچا۔ محکمہ جنگلات میں فارسیٹ آفیسر کی حیثیت سے اس علاقے میں اس کی پہلی پوسٹنگ تھی۔ مرزا نے اس کی رہائش کا انتظام حویلی ہی میں کر دیا، اور وہ Paying Guest کے طور پر ان کے ساتھ رہنے لگا اور پھر وسیم، مرزا کی بیوی اور خود مرزا ایک مثلث کے اضلاع کی حدوں کی طرح ابھرنے لگے۔ مرزا کی غیر متحرک اور مستحکم زندگی میں کچھ ہلچل سی آ گئی، گویا جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کشش، محبت اور رشک کی زیریں لہریں، تلاطم کے خاموش شور، اتھل پتھل اور اندیشے میں منتقل ہونے لگیں۔

مرزا سیماب صفت آدمی تھے۔ کبھی گھنٹوں خوش گپیاں، کبھی سارا سارا دن شطرنج میں الجھے رہتے۔ اکثر شطرنج کھیلتے کھیلتے قطعی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ہی، بساط پلٹ دیتے۔ کسی پروگرام کے لیے نکلنے کی تیاری ہو رہی ہے، اچانک پروگرام منسوخ۔

اس کی بیوی فاخرہ بھی اسی سانچے میں ڈھل گئی تھی، لیکن وسیم کی ہم سری اور رفاقت نے اسے شادکام بھی کیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے کے آرام، احساس اور جذبات کا خیال رکھنے لگے۔

شام کے وقت جب سورج اپنا سفر پورا کر کے مغرب میں روپوش ہو جاتا، چاند کی نرم، شیتل اور مدھم روشنی میں، چہل قدمی کرتے ہوئے وہ دور نکل آتے۔ چلتے چلتے جب تھک جاتے، کسی پلیا پر، یا زمین کے ایسے ٹکڑے پر، جہاں گھاس کی چادر بچھی ہو، وہ بیٹھ جاتے۔

اکثر ان کے درمیان خاموشی حائل ہوتی، کیونکہ دلوں میں اُبلنے والی جوالا مکھی کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل طمانیت کی بجائے انھیں بے چین کر دیتا، لیکن خاموشی بھی بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن ہوتی ہے۔ جب خاموشی کی چادر بہت گھنی ہو جاتی، فاخرہ دھیرے سے کہتی:

’’تم نے کچھ کہا—‘‘

’’نہیں تو...... تم نے کچھ سنا؟‘‘

’’شاید...... ہم دلوں کے گہرے اور اندھے کنویں میں قید ہیں...... اور خاموشی بے رحم اور سم قاتل ہے......‘‘

’’لیکن...... کلام بسا اوقات خاموشی سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ بپھری ہوئی شیرنی کو خاموشی سے قابو میں کیا جا سکتا ہے، لیکن لفظوں کا بار...... سارے وجود کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔‘‘

’’...... بپھری ہوئی شیرنی؟...... جذبات کی بات کر رہے ہو تم......؟ جذبات...... یہ آگ ہیں، آگ......، یہ بڑھتے اور پھیلتے ہی جاتے ہیں اور اپنی راہ کی تمام تر رکاوٹوں کو خاکستر کر دیتے ہیں—‘‘

جذبات کی تپش میں دونوں گرفتار تھے، پھر مثلث کے تینوں خطوط وسوسوں، خدشوں، سراسیمگی اور تذبذب کے بڑھتے، پھیلتے

سایوں میں محصور ہو گئے——

غیر یقینی صورت حال میں ایک شام لان میں کرسیوں پر بیٹھے، وہ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اچانک مرزا نے وسیم سے پوچھا:

''فاخرہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں سمجھا نہیں......''

''میں دراصل اس کے حسن کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔''

''تم خوش قسمت ہو، تم پر رشک کیا جا سکتا ہے۔''

''یعنی......؟''

''تمہاری بیوی یقیناً خوبصورت ترین عورت ہے اور ایک بہترین ساتھی بھی۔''

''شاید، تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن سچائی اکثر الجھنوں کو اور بھی الجھا دیتی ہے......''

وسیم خاموش رہا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ لیا، برا سا منہ بنایا اور پیالی ٹیبل پر رکھ دی، پھر سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور، ماچس سے سلگانے لگا۔ اس نے سگریٹ جلانے میں کئی تیلیاں صرف کیں۔ دراصل ماچس کی تیلیوں سے کھیلنے کی اس کی پرانی عادت تھی۔ اچانک مرزا نے کہا:

''یہ ایک بیہودہ حرکت ہے——''

''جی—— آپ کیا کہہ رہے ہیں......'' فاخرہ نے سرگوشی کی۔

مرزا نے بیوی کی طرف دیکھا، اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''مجھے لگتا ہے، اس گھر کے نیچے بارودی سرنگ بچھی ہوئی ہے۔ تمھارا ماچس کی تیلیوں سے اس طرح کھیلنا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

وسیم نے مرزا کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

فاخرہ نے دہشت اور سراسیمگی کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اچانک مرزا نے اپنی کرسی کھسکائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں لائبریری جا رہا ہوں......تم چل رہی ہو، میرے ساتھ یا تمہارا وسیم کے ساتھ آؤٹنگ کا کوئی پروگرام ہے۔''

''میں چل رہی ہوں۔''

فاخرہ نے بمشکل کہا۔ اسے محسوس ہوا، اس کی قوت گویائی اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ وہ خود کو بیمار اور کمزور محسوس کرنے لگی۔

لائبریری پہنچ کر مرزا کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر ٹیبل پر سر ٹکا دیا۔ فاخرہ مسحور کھڑی رہی۔ کئی بے رحم اور تکلیف دہ لمحے گزر گئے، بالآخر فاخرہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی مرزا کے پاس پہنچی اور اس کے بالوں میں اپنے ہاتھوں کی لمبی لمبی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی، پھر صدیاں گزر گئیں۔ بالآخر فاخرہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا:

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟''

مرزا نے سر اٹھایا، فاخرہ کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا:

''ان الماریوں سے کوئی ایسی کتاب نکال سکتی ہو، جو ہمیں راستہ دکھائے! کتاب، مذہب یا اسلامی تعلیم کی ہو یا ناول، جس میں دلوں کی داستان رقم ہو...... یا تاریخ کا کوئی عہد ڈھونڈ لو، جو فیصلے تک پہنچنے میں معاون ہو......''

''میں کچھ نہیں سمجھ سکی۔ کچھ نہیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں......میں اپنی اور تمھاری خوشی بحال رکھنا چاہتا ہوں۔''

''خوشی......! ہماری خوشی کو کیا ہوا......؟''

''دیمک لگ رہی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو؟ احساس مر گیا ہے، کیا؟ سنو فاخرہ بنت حیدر علی میں جھوٹ اور بے وفائی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے دکھ جھیلنے کی عادت نہیں۔ میں کشادہ دل آدمی ہوں۔ کیا تم سچ نہیں بول سکتی؟ تم چاہو تو میں تم سے دستبردار ہو جاؤں۔ مگر مجھے فریب نہ دو۔ کیا میں تمھیں باندھ کر رکھ سکتا ہوں! جھوٹی اور مصنوعی زندگی جینے سے حاصل؟ جھوٹی زندگی جینے والے ہر پل مرتے ہیں، ہر پل۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

فاخرہ ساکت اور خاموش تھی، جیسے وہ کسی پارک میں ایستادہ برستی بارش میں بھیگتا اسٹیچو ہو——

کچھ اذیت ناک لمحوں کے بعد اس نے پھر کہا:

''کیا تم وسیم سے محبت کرتی ہو؟ کیا وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے؟ ......سوچ لو، پھر جواب دینا۔'' پھر وہ اٹھا اور تیزی کے ساتھ لائبریری سے نکل گیا۔

(بقیہ ص۴۶ پر)

ڈاکٹر محمد نہال افروز

Assistant Professor (Urdu) Center for Distance and Online Education,
Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli - 500032 (Mob. 9032815440)

کھوئی ہوئی شناخت

گھر کی دیوار پر لگا بڑا آئینہ دھندلا سا لگ رہا تھا، یا شاید دھندلا پن علیزہ کی آنکھوں میں تھا۔ وہ روز اُسی آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی، اپنے چہرے کو تکتی اور سوچتی:

''یہ میں ہی ہوں؟ یا کوئی اور......؟''

علیزہ ایک گریجوئٹ لڑکی تھی اور ایک بڑے خواب کے ساتھ اپنی زندگی میں آگے بڑھ رہی تھی، لیکن ناگہاں شادی ہوجانے کی وجہ سے وہ ایک عام گھریلو عورت کی طرح اپنی زندگی گزانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ صبح جلدی اٹھنا، ناشتے کی تیاری کرنا، بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا، شوہر کے کپڑے استری کرنا، ان کا ٹفن تیار کرنا اور پھر دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہنا۔ شام ہوتے ہی چائے کے ساتھ ساس کی باتیں سننا اور پھر رات کا کھانا بنانے کے بعد تھک کر بستر پر گر جانا۔ یہ سب کچھ لمبے وقت سے اس کے اندر ایک خلا پیدا کر رہا تھا، مگر وہ اسے نظرانداز کرتی جا رہی تھی۔

''عورت کا اصل مقام اس کے گھر کی چہار دیواری ہوتی ہے۔'' علیزہ کی ساس اکثر کہا کرتی تھیں اور وہ ہر بار ان کی یہ بات سن کر اپنا سر جھکا لیتی تھی۔

''مگر کیا واقعی عورت کا کوئی اور مقام نہیں ہوتا......؟''

یہ سوال علیزہ کے ذہن میں اب اکثر گونجنے لگا تھا۔ کیا واقعی عورت کا مقام صرف اس کے گھر کی چہار دیواری تک محدود ہے؟ یا اس کی خواہشات، اس کے خواب اور اس کی اپنی شناخت کی بھی کوئی حیثیت ہوتی ہے؟

رات کے سناٹے میں اکثر وہ سوچتی کہ اس کا وجود محض دوسروں کی خدمت کے لیے ہی ہے؟ اس کے خواب، اس کی امنگیں، اس کی پہچان کیا صرف ایک بیوی، بہو اور ماں ہونے میں ہی محدود ہے؟ کبھی وہ ماضی کی طرف پلٹتی، جہاں وہ ایک باہمت، باصلاحیت اور ایک بڑا خواب دیکھنے والی ایسی لڑکی تھی، جو کچھ بننا چاہتی تھی، جو دنیا کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتی تھی، جو معاشرے کی لیے کچھ کرنا چاہتی تھی، جو مستقبل میں ہونے والے اپنے بچوں کے لیے ایک مثال بننا چاہتی تھی، مگر شادی کے بعد جیسے اس کی اپنی شناخت ہی کھو گئی تھی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی تھی، اگر وہ بھی باہر نکل کر کچھ کام کرتی اور اپنی شناخت بنالیتی، تو کیا اس کی زندگی مختلف ہوتی؟ کیا وہ اس گھریلو زندگی سے زیادہ خوش رہتی؟ مگر پھر اسے احساس ہوتا کہ یہ سوالات کرنا ہی بے معنی ہیں، کیونکہ اس کی زندگی کی راہیں تو اب طے کردی گئی ہیں۔

''لیکن کیا واقعی اب کچھ نہیں بدلا جا سکتا؟''

یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے سوچا کہ اب وہ خود کو تلاش کرے گی، اپنی شناخت دوبارہ بنائے گی۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی کشمکش میں دل کی سننے کا فیصلہ کیا، الماری میں رکھی اپنی پرانی کتابیں نکالیں اور اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کا عزم کیا۔ اس نے پڑھنا لکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ ان دنوں کو محسوس کرنے لگی تھی، جب وہ اپنے خواب بن رہی تھی۔ اب بھی وہ دن بھر مصروف رہتی تھی، لیکن اب وہ خوش رہتی تھی۔

ایک دن وہ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سے سیاہ حلقے ابھر آئے تھے، چہرے پر ایک عجیب سی پژمردگی چھائی تھی، مگر سب سے زیادہ اسے اپنی آنکھوں میں بجھا ہوا خواب اسے کھٹکنے لگا۔ اچانک پیچھے سے ساس کی آواز آئی:

''علیزہ، چائے بن گئی؟''

وہ چونک کر پلٹی: ''جی، بنا دیتی ہوں۔''

چائے بناتے ہوئے اس کے دماغ میں خیالات کا ایک

طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ کتنے ہی سالوں سے دوسروں کی خوشی کے لیے سب کچھ کر رہی تھی، مگر خود کے لیے؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ اس نے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ اچھی عورت وہی ہوتی ہے جو گھر سنبھالے، شوہر کی خدمت کرے، بچوں کی دیکھ بھال کرے..... مگر کیا اچھی عورت وہ نہیں ہوتی جو خود کو بھی سنبھالے؟

رات کو جب سب سو چکے تھے تو وہ چپکے سے بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے بالوں کو چھوا، جیسے اسے جگانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ خود سے کہا:

''چاند بھی تو آسمان پر اپنی جگہ بنائے رکھتا ہے، پھر میں کیوں نہیں بنا سکتی؟''

اگلی صبح اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج سے وہ خود کے لیے کچھ کرے گی۔ صبح کے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے الماری میں رکھی اور بھی پرانی کتابیں اور رسالے نکالے، جن کو برسوں سے اس نے بڑی شوق کے ساتھ سنبھال رکھا تھا۔ اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی شوق تھا، لیکن زندگی کی مصروفیات میں اس کا یہ شوق کہیں دب کر رہ گیا تھا۔ وہ اب اس شوق کو پورا کرنا چاہ رہی تھی۔

کاغذ اور قلم ہاتھ میں لیتے ہی اسے یوں لگا جیسے برسوں بعد کسی بچھڑے دوست سے ملاقات ہو رہی ہو۔ پہلا جملہ لکھنے میں کچھ لمحے لگے، مگر پھر الفاظ جیسے خود بہ خود کاغذ پر بکھرتے چلے گئے۔

یہ پہلا قدم تھا، اسے لگا جیسے وہ خود کو دوبارہ پانے کے سفر پر نکل چکی ہو، لیکن اچانک خود کے سوالوں میں الجھ بھی گئی۔

''کیا یہ آسان ہوگا.....؟''

''شاید نہیں، مگر کیا یہ ضروری ہے.....؟''

''بے شک، ہاں..... کیوں کہ میں ایک گھریلو عورت ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں کے لیے ایک مثالی ماں بننا چاہتی ہوں۔''

ایک دن دوپہر کے وقت، جب سب قیلولہ کر رہے تھے، علیزہ نے اپنی الماری کی سب سے اوپر والی دراز کھولی۔ اس میں ایک پرانی نوٹ بک رکھی تھی، جس کے صفحات وقت کے ساتھ ساتھ زرد پڑ چکے تھے۔ یہ اس کے خوابوں کی نوٹ بک تھی، جس میں اس نے اپنی خواہشات لکھی تھیں—اکیڈمک کانفرنس میں شرکت، کسی بڑی کمپنی میں ملازمت، اپنے نام سے کچھ تخلیق کرنا، کسی اچھے اسکول میں پڑھانا......!

وہ ایک ایک صفحہ پلٹتی گئی اور اپنے ہر خواب کو ٹوٹا ہوا محسوس کرتی رہی۔

''کیا یہ سب کچھ میں نے خود چھوڑا تھا؟ یا مجھے مجبور کیا گیا؟''

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کی چھوٹی بیٹی ہنستی ہوئی اندر آئی۔

''امی، دیکھیں! میں نے نئی ڈرائنگ بنائی ہے!''

علیزہ نے مسکراتے ہوئے تصویر کو دیکھا—اس میں ایک عورت تھی، جس کا چہرہ خالی تھا، آنکھوں میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

''یہ کون ہے، بیٹا؟'' علیزہ نے پوچھا۔

''یہ تم ہو ماں......!''

بچی نے معصومیت سے کہا اور بھاگ کر باہر چلی گئی۔

علیزہ کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ اس کی اپنی ہی بچی اسے ایک خالی چہرے کے طور پر دیکھ رہی تھی۔

اسی رات جب سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے تو علیزہ نے پہلی بار اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔''

اس کا شوہر، جو اخبار پڑھ رہا تھا، چونک کر اسے دیکھنے لگا:

''کیا کرنا چاہیے۔ سب کچھ تو کر رہی ہو۔''

''میرا مطلب ہے کہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے...... جیسے کہ نوکری۔'' علیزہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''نوکری؟ تمہیں کیا ضرورت؟ سب کچھ تو ہے ہمارے پاس!''

''ہاں، سب کچھ ہے، مگر میں نہیں ہوں۔'' علیزہ کی آواز میں وہ ہلکی سی لرزش تھی، جو کسی طویل خاموشی کے بعد آتی ہے۔

ساس نے ناگواری سے چمچ پلیٹ میں رکھا اور کہا:

''عورت کا کام گھر سنبھالنا ہے، باہر جا کر نوکری کرنا نہیں!''

''مگر میں نے تعلیم اسی لیے تو حاصل کی تھی کہ میں کچھ بن سکوں، کچھ کر سکوں۔'' علیزہ نے مضبوطی سے کہا۔

''اگر تم کام پر جاؤ گی، تو گھر کا کیا ہوگا؟ بچوں کا کیا ہوگا؟''

شوہر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
''گھر اور بچے میری ذمہ داری ضرور ہیں، مگر میں خود بھی تو ایک انسان ہوں۔ میری بھی اپنی خواہش ہے۔''
شوہر نے اخبار میز پر رکھ دیا اور علیزہ کو غور سے دیکھنے لگا۔
''تمہیں اچانک یہ خیال کیسے آ گیا؟''
اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔
''یہ خیال اچانک نہیں آیا، بس میں نے اب ہمت کر کے کہہ دیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے علیزہ نے اپنی نظریں جھکا لیں۔
''کیا تمہیں نوکری کرنا واقعی ضروری ہے؟''
شوہر علیزہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولا۔
''جی ہاں — ! میرا مقصد صرف نوکری کرنا نہیں ہے بلکہ اپنے بچوں کے لیے مثال بھی بننا ہے۔'' علیزہ اعتماد سے بھرپور تھی۔
ساس نے خفگی سے سر جھٹکا:
''یہ سب آج کل کے ڈراموں کا اثر ہے! عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے اور تمہیں تو کوئی کمی بھی نہیں!'' علیزہ نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا:
''ماں جی، یہ بات صرف کمی یا ضرورت کی نہیں، یہ میری شناخت کی بات ہے۔ میں نے بھی خواب دیکھے تھے، میں بھی کچھ بننا چاہتی تھی۔''
شوہر نے تھوڑا نرم ہوتے ہوئے کہا:
''مگر بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ماں کی محبت سے محروم ہوں۔''
علیزہ نے مسکرا کر اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور کہا:
''میں بھی نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے دور ہوں، مگر کیا انہیں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ ان کی ماں صرف ان کی دیکھ بھال کرنے والی نہیں بلکہ ایک خود مختار عورت بھی ہے، جو اپنے خوابوں کو زندہ رکھنا جانتی ہے؟''
کمرے میں لمحہ بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ساس نے تیوری چڑھائی، مگر شوہر سوچ میں پڑ گیا۔ علیزہ نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ کیا وہ اس کی خواہش کو سمجھ سکے گا؟
علیزہ کے لیے یہ سب کچھ کرنا کسی جنگ سے کم نہیں تھا۔
کئی دنوں تک خاموشیاں چھائی رہیں، ساس کی طرف سے طنزیہ جملے کسے گئے، شوہر معتدل رہا، مگر علیزہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے نوکری کی تلاش شروع اور جلد ہی ایک اسکول میں اسے جاب مل گئی۔
پہلا دن تھا۔ علیزہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ آج آئینے میں اس کا عکس مختلف لگ رہا تھا — آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی اور ہونٹوں پر ایک خود اعتمادی بھری مسکراہٹ۔
جب وہ باہر نکلی تو اس کی وہی چھوٹی بیٹی دروازے پر کھڑی تھی، جس نے علیزہ کی ڈرائنگ بنائی تھی۔
''امی......! آج آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں!''
بیٹی کا یہ جملہ علیزہ کے دل میں اتر گیا۔ وہ جانتی تھی، آج وہ واقعی ''خود'' کو حاصل کر چکی ہے۔
یہ پہلا دن ضرور تھا، مگر ایک نئے سفر کا آغاز بھی تھا۔ علیزہ نے بیٹی کی بات سن کر مسکرا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی، مگر یہ غم کے نہیں خوشی کے آنسو تھے۔
آج وہ ایک نئی راہ پر قدم رکھنے جا رہی تھی۔ برسوں تک اس نے اپنی خواہشات کو دوسروں کے لیے پس پشت ڈال دیا تھا، مگر آج کا دن مختلف تھا۔ آج وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کی طرف پہلا قدم اٹھا رہی تھی۔
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے علیزہ نے گہری سانس لی اور پرس میں لگے چھوٹے سے آئینے میں خود کو دوبارہ دیکھا۔ اس کو اپنا وہی چہرہ نظر آیا، مگر وہ ایک نئی روشنی اور ایک نئی امنگ سے بھرا ہوا تھا۔ راستے بھر اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی، مگر اس کی ہر دھڑکن میں جوش تھا اور ایک نئی امید بھی۔
جب وہ اسکول میں پہنچی، تو اس کے قدموں میں ایک نیا اعتماد تھا۔ پرنسپل کے روم کا دروازہ کھولتے ہی، وہاں موجود سب کی نظریں اس پر پڑیں۔ کچھ حیران تھیں اور کچھ متاثر۔ علیزہ نے ایک لمحے کے لیے خود کو سنبھالا، پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ آج وہ محض ایک گھریلو عورت نہیں تھی بلکہ آج وہ اپنے خوابوں کی مسافر تھی، جس کو حقیقت میں تبدیل کر رہی تھی۔
اسکول کا ماحول علیزہ کے لیے بالکل نیا تھا۔ اسٹاف روم

میں داخل ہوتے ہی کچھ سینئر اساتذہ نے اسے اجنبی نظروں سے دیکھا، جیسے وہ اس کی قابلیت کو پرکھ رہے ہوں۔ان میں سے ایک استاد نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''پہلا دن ہمیشہ مشکل ہوتا ہے،مگر دیکھتے ہیں آپ کے لیے کب تک مشکل رہتا ہے!''

یہ جملہ علیزہ کے حوصلے کو آزمانے کے لیے کافی تھا،مگر اس نے شائستگی سے مسکرا کر جواب دیا:

''دیکھتے ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ میں یہاں بہت کچھ سیکھوں گی اور سکھاؤں گی بھی۔''

پہلے دن کی کلاس میں بچے خوب شرارت کر رہے تھے۔ کسی نے کرسی پر چیونگم چپکا دی تھی، کسی نے بلیک بورڈ پر کارٹون بنا دیا تھا تو کوئی کلاس میں بیٹھنے کے بجائے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ علیزہ نے گہری سانس لی اور مصلحت سے کام لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا:

''میں جانتی ہوں کہ آپ سب بہت ذہین ہیں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ ہم سب مل کر اچھے سے پڑھائی کریں گے اور اپنے اپنے خوابوں کو پورا کریں گے۔''

آہستہ آہستہ بچوں نے علیزہ کی باتوں پر توجہ دینا شروع کر دیں۔دن، ہفتے، مہینے گزرتے گئے۔علیزہ نے نہ صرف بچوں کے دل جیتے بلکہ اپنی محنت سے اسکول میں ایک اہم مقام بھی حاصل کر لیا۔ جب سالانہ رزلٹ آیا تو اس کے پرچے کے نتائج سب سے بہتر تھے۔ پرنسپل نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا:

''آپ نے واقعی خود کو ثابت کر دیا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ آج سے آپ اسکول کے مینجمنٹ کا عہدہ سنبھالیں!''

یہ سنتے ہی علیزہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ جانتی تھی کہ سفر آسان نہیں تھا، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔آج وہ اپنے خواب کی تعبیر کے قریب تھی۔

اس شام جب وہ گھر پہنچی، تو اس کی بیٹی نے پوچھا:

''امی، آپ خوش ہیں نا......؟''

علیزہ نے بیٹی کو گود میں اٹھا کر کہا:

''ہاں بیٹا، کیونکہ میں نے جان لیا ہے کہ ہارنے والے وہی ہوتے ہیں جو کوشش کرنا چھوڑ دیتے ہیں!''

جیسے ہی علیزہ نے یہ الفاظ کہے، بیٹی نے معصومیت سے پوچھا:

''امی، اگر کبھی ہم تھک کر ہار جائیں تو کیا کریں؟''

علیزہ مسکرائی، بیٹی کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور کہا:

''بیٹا، تھک جانا کوئی بری بات نہیں ہے، لیکن رُک جانا ٹھیک نہیں ہے۔اگر کبھی تھک جاؤ، تو کچھ دیر رُک کر سانس لے لو، اپنے خواب کو یاد کرو اور پھر نئی طاقت کے ساتھ آگے بڑھو!''

یہ سنتے ہی بیٹی کی آنکھوں میں چمک آ گئی...... اس نے ماں کے گلے لگ کر کہا:

''امی، پھر ہم کبھی نہیں رکیں گے!''

یہ سن کر علیزہ کو اپنی تمام محنت اور جدوجہد یاد آ گئی۔وہ جانتی تھی کہ کامیابی صرف منزل تک پہنچنے کا نام نہیں بلکہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھنے کا نام ہے۔وہ بیٹی کو سینے سے لگا کر بولی:

''بالکل بیٹا، ہم ہمیشہ آگے بڑھتے رہیں گے!''

یہ لمحہ اس کے لیے ایک نیا حوصلہ تھا۔علیزہ نے بیٹی کو مضبوطی سے گلے لگایا اور ایک گہری سانس لی۔زندگی کے سفر میں اس نے جو کچھ سیکھا تھا، آج وہ اپنی بیٹی کو سکھا رہی تھی۔اچانک کھڑکی سے آتی ہوا نے پردہ ہلایا، جیسے کائنات بھی اس کے عزم کو سلام پیش کر رہی ہو۔علیزہ نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں ستارے چمک رہے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے اس کے خواب۔

بیٹی نے ماں کے ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے کہا:

''امی، ہم ہمیشہ اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگیں گے، نا؟''

علیزہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں ایک نئی امید جھلک رہی تھی۔اس نے سر ہلایا اور مضبوط لہجے میں کہا:

''نہیں بیٹا، ہم اپنے خوابوں کے پیچھے نہیں بھاگیں گے ......ہم انہیں حقیقت میں بدلیں گے!''

بیٹی نے خوشی سے ماں کے گلے لگتے ہوئے کہا: ''امی، پھر ہم کیسے اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلیں گے؟''

علیزہ نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا:

''بیٹا، خواب صرف سوچنے سے پورے نہیں ہوتے، ان کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ پہلے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کا راستہ ڈھونڈو، پھر دل لگا کر کام کرو۔''

بیٹی نے پرجوش لہجے میں کہا:

''تو کیا ہم مل کر کام کریں گے؟ آپ میرا ہاتھ تھامیں گی نا؟''

علیزہ نے بیٹی کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا:

''ہم ہمیشہ ساتھ ہوں گے، تمہارا ہر قدم میری دعاؤں میں ہوگا اور تمہاری محنت تمہیں منزل تک ضرور لے جائے گی۔''

بیٹی کی آنکھوں میں چمک آگئی: ''امی، میں ابھی سے محنت شروع کرنا چاہتی ہوں! سب سے پہلے کیا کرنا ہوگا؟''

علیزہ نے مسکرا کر کہا ''سب سے پہلے، ہمیں اپنے خواب کو واضح کرنا ہوگا، پھر اسے حقیقت میں بدلنے کے لیے ایک مضبوط ارادہ اور مسلسل محنت کی ضرورت ہوگی۔''

بیٹی نے پرجوش لہجے میں کہا: ''تو پھر آج سے ہی شروعات کرتے ہیں، امی!'' علیزہ نے بیٹی کو گلے لگالیا اور کہا:

''ہاں بیٹا، آج ہی سے اور ابھی سے!''

یہ کہتے ہی علیزہ کو لگا جیسے اس کے اندر ایک نئی روشنی جاگ اٹھی ہو۔ آج اس نے صرف اپنی کامیابی کا جشن نہیں منایا تھا بلکہ اپنی بیٹی کے دل میں بھی ایک ایسا عزم جگادیا تھا جو اسے ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت دے گا۔

علیزہ نے دھیرے سے اپنا سر بیڈ پر تکیے سے لگا دیا اور آنکھیں بند کر کے پرسکون حالت میں لیٹ گئی، جیسے اس کی خواہش پوری ہوگئی تھی، جیسے اس کے خوابوں کی تعبیر ہو چکی تھی، جیسے اس کو اپنی کھوئی ہوئی شناخت دوبارہ مل گئی تھی۔ ❁❁

احساس کے ویرانے میں (ص ۴۱ سے آگے)

اس رات، بیڈ پر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ عالم اضطراب میں اس نے محسوس کیا، اس کی بغل میں بظاہر سوئی ہوئی فاخرہ بھی دراصل جاگ رہی ہے۔ وہ بیڈ سے اٹھا، اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک وہ بیڈروم سے باہر نکل گیا— وسیم کے کمرے کے قریب جا کر وہ ٹھہر گیا۔ اسے محسوس ہوا۔ کمرے کے اندر وہ بھی جاگ رہا ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

''کون......؟''

''میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔''

''خیریت......؟ آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔''

وسیم نے دروازہ کھولنے کے بعد، اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں— شاید ہم سبھی پریشان ہیں۔ کہانی ایسے موڑ پر ہے، جہاں سانسیں رکتی سی معلوم ہورہی ہیں۔ کیا بہتر نہ ہوگا ہم مل کر، سوچ کر، کوئی راہ نکالیں، بھلائی اور فلاح کی راہ......''

''فلاح، بھلائی! کس لیے، کہاں ہے فلاح......؟''

''ہمارے لیے، فلاح سچائی میں ہے، صدق دلی میں ہے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے، میں سچائی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر شاید تم نے کبھی کہا تھا۔ سچائی سے الجھنیں اکثر بڑھ جاتی ہیں۔''

''فلاح پیش نظر ہو تو الجھن نہیں ہوگی۔ چلو، میرے بیڈروم میں چلو، فاخرہ سامنے ہوگی تو شاید کچھ طے کرنا آسان ہو۔''

چند لمحوں بعد وہ بیڈروم میں تھے۔ مرزا نے دھیرے سے پکارا۔

''فاخرہ......''

وہ فوراً اٹھ گئی، اور اس نے حیرت اور خوف سے انھیں دیکھا۔ مرزا نے کہا:

''میں سوچتا ہوں، گھلتے رہنے سے بہتر ہے، دھند صاف ہوجائے، ہم جلد راستہ طے کرلیں۔ میں نے تمہاری موجودگی بھی ضروری سمجھی، اس لیے یہاں......''

''کیا آپ مجھے رسوا کریں گے؟''

''نہیں......'' مرزا کی آواز سپاٹ تھی، پھر اس نے وسیم کی طرف مڑ کر دیکھا اور پوچھا: ''کیا تمھیں فاخرہ سے محبت ہے......؟''

''شاید......''

''اور شاید تم سے کہیں زیادہ فاخرہ سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کی ہر خوشی کا میں نے ہمیشہ لحاظ رکھا ہے اور آج اس خوشی میں بھی مزاحم بننا نہیں چاہتا—!'' ❁❁

انشائیہ

ایس معشوق احمد

Near Ziyarat Shareef Takibal Kelam, Kulgam - 192231 (Mob. 8493981240)

آؤ! چائے پیو

صاحبو! ہمارے یہاں اب چائے مشروب نہ رہی بلکہ نشہ بن گئی ہے۔اس نشے کی لت میں مبتلا افراد ہر گھر میں پائے جاتے ہیں۔ چھوٹے، بڑے، صحت مند بیمار، کامیاب، ناکام، کاروباری، بیوپاری، مزدور، سرکاری ملازم، پرہیزگار، مکار، شریف، رذیل سارے افراد ہی چائے پیتے ہیں اور جیتے ہیں۔

سرکاری آفس میں کوئی کام اٹک جائے تو چائے پلا دیجئے خلاصی ہوجائے گی، سر میں درد ہے تو چاہے پیجئے درد سے نجات مل جائے گی، گھر میں خصوصی مہمان آئے تو چائے کا دور چلتا ہے۔

کوئی یار دوست آئے تو چائے بنائی جاتی ہے، گھر میں پرولیش کرنا ہو تو چائے، نئے گھر کی تعمیر کرنی ہو تو چائے، گرمی کا توڑ کرنا ہو تو چائے اور سردی نے تنگ کیا تو چائے سے بہتر علاج کوئی نہیں۔ گویا چائے قومی نشہ بن گئی ہے۔

ایسے کم عقلوں کی قلت نہیں جو غم غلط کرنے کے لئے سگریٹ کا سہارا لیتے ہیں اور کچھ مورکھ انگور کی بیٹی سے پینگیں بڑھا کر قرار کے امیدوار بنتے ہیں۔کوئی بھنگ پینے کی لت میں لت پت ہوا تو کوئی سیانا نکلا اور اس نے مختلف امراض میں مبتلا کرنے والی نشہ آور چیزوں سے پرہیز برت کر چائے کی چسکیوں میں سکون پایا۔

چائے کسی کی عادت بن گئی ہے تو کسی کا نشہ، کسی کا مشغلہ ہے تو کوئی شوق میں پیالی پر پیالی پی کر راحت محسوس کرتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ چائے واحد مشروب ہے جو نشہ بھی ہے اور شوق بھی، دوا بھی ہے اور علاج بھی، مریض کو کھانا کھانے سے منع کیا جائے تو چائے کی پیالی بھوک کی تلوار سے بچانے کے لئے ڈھال بن کر سامنے آتی ہے۔کوئی کام کی زیادتی سے تھک ہار کر سر تھام کر بیٹھ گیا ہے تو چائے راحت کا روپ دھارن کر کے اس کی تھکاوٹ کو دور کرتی ہے۔ چائے ہر مرض کی دوا بن گئی اور ہر عارضے سے افاقے کا سبب۔

مرزا تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شراب کے بعد چائے ہی ایسا مشروب ہے جو بندے کو مدہوش، شاد اور اپنی بدحالی سے بے خبر رکھ کر ایک نئی دنیا کا باسی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہمارے یہاں نمکین اور میٹھی چائے کثرت سے پی جاتی ہے اور پلائی جاتی ہے۔ چائے پینے سے دل کو قرار اور پلانے سے رشتوں میں اعتبار آتا ہے۔اس مشروب سے میٹھا کچھ نہیں، حالانکہ مرزا کا خیال اس سے مختلف ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میاں چائے پینے سے زیادہ مزا غیبت کرنے اور یار سے گفتگو کرنے میں آتا ہے کہ ؎

ہمیشہ ٹھنڈی ہو جاتی تھی چائے باتوں باتوں میں
وہ باتیں جو ان آنکھوں سے کیا کرتے تھے ہم دونوں

ہمارے یہاں ''آؤ چائے پیو'' سب کا تکیہ کلام بن گیا ہے، جو بھی ہمارے سامنے سے گزر جائے اس کو یہ صدا ضرور لگاتے ہیں کہ:

''آؤ چائے پیو......!''

کوئی اجنبی راستے سے گزر رہا ہو یا کوئی اپنا سامنے آ جائے، گھر کا بھیدی ہو یا باہر کا بیدوا، اپنا ہو یا پرایا، نزدیک ہو یا دور، پسر ہو یا پدر یا ہو آنکھوں کا نور، رشتہ دار ہو یا کسی کا پرانا پیار، سب کو یہ پکار ضرور لگاتے ہیں کہ:

''آؤ چائے پیو......!''

میں بھی کسی گلی، کوچے سے گزر جاؤں تو شناسا صدا ضرور دیتے ہیں کہ:

''آؤ چائے پیو......!''

مجھے یقین ہے آپ کے جاننے والے بھی آپ کو ندا دیتے ہوں گے کہ:

''آؤ چائے پیو......!''

مرزا کہتے ہیں کہ یوں تو انسان شراب سے لے کر غریبوں کے خون تک سب پینے کا عادی ہے، لیکن جو مزہ چائے کی چسکی میں ہے

وہ وسکی میں بھی نہیں ہے۔ میاں پینے کے لئے چائے بہترین مشروب ہے، گر دوسروں کے یہاں پی جائے۔

مرزا کی نصیحت سن کر گھر سے پکا ارادہ کر کے نکلتا ہوں کہ آج فلاں کے یہاں چائے ضرور پی لوں گا، لیکن کوشش نے کبھی کامیابی کا لباس نہ پہنا۔ میں ایک صاحب کے پاس پچھلے آٹھ سال سے جا رہا ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی اور مسرت ان کے چہرے پر اُمڈ آتی ہے اور وہ اپنی بیگم کو آواز لگاتے ہیں:

''دیکھو معشوق آیا ہے۔''

اس کے فوراً بعد اپنی بیگم کے سامنے مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں:

''چائے پیو گے......؟''

میں بیچارا شرم کا مارا زبان باہر نکال کر دکھاتا ہوں۔

''صاحب ابھی کھانا کھا کر آ گیا ہوں۔''

اگر کبھی شرم کو بالائے طاق رکھ کر جواباً کہہ بھی دوں:

''ہاں صاحب چائے پلائیں، ضرور پلائیں۔''

تو چائے کے بجائے وہ بہانوں کا شربت تیار کر کے پلاتے ہیں:

''ابھی گیس ختم ہوگئی ہے اور بجلی کل سے نہیں آئی۔ بیگم شکایت کر رہی تھیں کہ تم وقت پر کبھی کچھ لاتے ہی نہیں ہو۔ اس مہنگائی کے دور میں بندہ گیس لائے، بجلی کا بل بھرے یا کھانے پینے کی اشیا کا انتظام......صاحب بڑی پریشانی میں گزر بسر ہو رہی ہے۔ بیگم کی کمر میں درد ہے، اُٹھنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی آرام کرنے کو کہا ہے۔ اب میں کیا کہوں، کہتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے چولہا خراب ہو گیا ہے، مرمت کرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ جلد آئے تو اس پر چائے بنا کر آپ کو پلاؤں گا۔ بغیر دودھ کے بھلا چائے بھی کوئی پیتا ہے۔ کم بخت دودھ والا ابھی آیا ہی نہیں۔ صاحب کیا کہوں، دس بارہ سال قبل گائے بیچ دی تھی تب سے بڑی پریشانی ہے۔ دودھ والا کبھی وقت پر دودھ نہیں لاتا۔ لائے بھی تو پانی ملے دودھ سے چائے پھیکی بن جاتی ہے۔ پھیکی چائے پینے میں مزہ بھی تو نہیں آتا۔''

یہ سارے عذر سن کر بندہ شرمندہ ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیوں اقرار کیا تھا کہ ہاں چائے پینی ہے۔ بہانے باز کے سامنے مجھے بہانے بنانے نہیں آتے۔ حیلہ جو جب کبھی میرے غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے حکم دیتے ہیں:

''باتیں اور سلام وغیرہ بعد میں پہلے چائے پلاؤ۔ سر میں درد ہو گیا ہے، ٹریفک جام کی وجہ سے حالت بگڑ گئی ہے، جلدی چائے پلاؤ تو سکون آ جائے۔''

چائے پینے کے بعد صاحب کا موڈ ہوا تو کھانا کھا کر جاتے ہیں، ورنہ روٹیاں بنوا کر ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ راستے میں دقت نہ ہو۔

داناؤ! آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔ ویسے بخیل اور وکیل ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ شیطان کے جال، وکیل کی چال، مسکین کے حال اور کنجوس کے مال سے پناہ مانگو کہ ان سے زندگی وبال بن جاتی ہے۔ اگر آپ وبال کے جنجال سے بچنا چاہتے ہیں تو جہاں آواز سنائی دے کہ:

''آؤ چائے پیو......!''

وہاں گھس جائیں حال بھی درست ہوگا اور مال بھی بچ جائے گا۔

❀❀❀

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code، مکمل پتہ اور موبائیل نمبر بھی تحریر کریں۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں اور تمام مطلوبہ تفصیلات لکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

گاہے گاہے......

سہیل عظیم آبادی

کہانیوں کی کہانی

کہانی کی بھی کہانی ہوتی ہے۔ لکھنے والے کے ذہن میں خیال آنے سے شکل اختیار کرنے تک اور شکل اختیار کرنے سے کاغذ پر منتقل ہونے تک کی ایک مسلسل اور دلچسپ کہانی ——— گرچہ یہ کہانی کاغذ پر منتقل نہیں ہوتی اور اس کہانی کو لکھنے والے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کہانی کا خیال ذہن میں آتا ہے، پھر وہ دھیرے دھیرے شکل اختیار کرتی ہے اور مختلف دور میں مختلف شکلیں بدلتی ہے اور آخر کاغذ پر پھیل جاتی ہے۔اس سارے عمل کی نشانی بچے کی پیدائش سے دی جاسکتی ہے۔

کہانی لکھنے والا کچھ دیکھتا ہے، کچھ سنتا ہے یا کچھ پڑھتا ہے اور اس کا ردعمل اس کے ذہن پر ہوتا ہے۔کبھی کوئی ردعمل بالکل بروقت ہوتا ہے، تھوڑی دیر یا کچھ دن ذہن پر چھایا رہتا ہے، پھر خود ہی مٹ جاتا ہے اور پھر کبھی نہیں اُبھرتا۔کبھی کوئی ردعمل کوئی ہلکا سانقش چھوڑتا ہے اور کبھی گہرا۔ یہ نقوش ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ یہی ردعمل کہانی کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر واقعہ ہر مشاہدہ یا ہر مطالعہ کا ردعمل لکھنے والے کو لکھنے پر مجبور کر دے اور کہانی کی تخلیق کا سبب بن جائے۔خواہ وہ واقعہ سنگین ہی ہو اور لکھنے والے پر اس کا ردعمل وقتی طور پر سخت ہوا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی واقعہ لکھنے والے کو بہت زیادہ متاثر کرے اور ردعمل کے طور پر اس کا ذہن کہانی کی تخلیق پر بالکل آمادہ ہوجائے۔کہانی اس کے ذہن میں شکل بھی اختیار کرے، لیکن پھر ذہن سے کاغذ پر منتقل کرنے تک سارے اثرات ختم ہوجائیں اور کہانی کبھی وجود میں نہ آئے۔اس کے خلاف یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی معمولی سا واقعہ کبھی کسی لکھنے والے کے ذہن پر بالکل ہلکا سانقش چھوڑ جائے اور یہ نقش بے اثر بنا دبا رہے، لیکن دوسرے ہی وقت اور ضمنی واقعات یا دوسرے واقعات ایسے اثرات مرتب کریں کہ کہانی لکھنے والا لکھنے پر مجبور ہوجائے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ دو یا دو سے زیادہ لکھنے والوں کے مشاہدے میں آتا ہے، لیکن کسی پر اس کا ردعمل ایسا ہوتا ہے کہ وہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کسی میں لکھنے کی تحریک پیدا ہی نہیں ہوتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت پہلے کا کوئی واقعہ لکھنے والے کی یادداشت میں محفوظ رہتا ہے اور کسی وقتی جھٹکے سے یکا یک اُبھر آتا ہے اور کہانی کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔یعنی کہانی کی تخلیق لکھنے والے کے موڈ اور ماحول پر منحصر ہے، خود لکھنے والا بھی یہ نہیں جانتا کہ کب کس چیز کا اثر لے گا اور کس چیز کا نہیں۔

کبھی مختلف مشاہدوں، مطالعوں سے مرتب اثرات جو دماغ میں بکھرے ہوتے ہیں اور دبے پڑے رہتے ہیں، یکا یک اُبھر آتے ہیں یا ایک مشاہدہ دوسرے مشاہدے سے اُبھر آتا ہے اور پھر کہانی کا تانا بانا خود سے تیار ہونے لگتا ہے۔ مشاہدوں کے بالکل چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جنہیں خود لکھنے والا بھی کبھی فاضل مواد سمجھتا تھا، کام کی چیز بن جاتے ہیں اور یہی ٹکڑے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، مل کر ایک خوبصورت کہانی کا ڈھانچہ تیار کر دیتے ہیں اور خود لکھنے والا بھی اچنبھے میں رہ جاتا ہے۔

غرض کہ تخلیقی عمل کی رَو کچھ عجیب سی ہوتی ہے اور جب تک لکھنے والا اس رو پر قدرت حاصل نہیں کرتا، کہانی کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں۔ دراصل جو لکھنے والا اس تخلیقی عمل کی رو پر جتنی قدرت رکھتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا اور کامیاب لکھنے والا ہوتا ہے۔ یہ تخلیقی رَو بڑی طاقتور ہوتی ہے اور اس پر قابو پالینا آسان کام نہیں۔کبھی کبھی خود لکھنے والا بھی اس رو میں بہک جاتا ہے اور کچھ نہیں کر پاتا، یا کچھ کا کچھ کر دیتا ہے۔

تخلیقی عمل کی رو پر قدرت پالینے کے بعد بھی یہ کام آسان نہیں رہ جاتا جب تک کہانی کاغذ پر مکمل نہ ہوجائے، لکھنے والے کا دل

اور دماغ مسلسل جھٹکے کھاتا رہتا ہے کبھی کبھی وہ اپنے کو بے حد کمزور اور بے بس محسوس کرتا ہے اور کہانی اور اس کے کردار اسے کھینچ کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ لکھنے والا ہفتوں، بلکہ مہینوں ایک کہانی کی ذہن میں تعمیر اور ترمیم کرتا رہتا ہے، پھر بھی کہانی مکمل نہیں ہوتی ہے اور کبھی وہ کہیں سے شروع کر کے کہیں ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن کہانی کہیں ختم ہوتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک کہانی لکھنے والے کے دماغ میں چکر کاٹتی رہتی ہے، لیکن وہ لکھی نہیں جاتی اور اسی دوران میں دو تین کہانیاں مکمل ہو جاتی ہیں اور پہلی کہانی دماغ کے اندر گھومتی ہی رہتی ہے اور لکھنے والے کی کوشش کے بعد اسی راستے پر آگے نہیں بڑھتی، جسے وہ چاہتا ہے۔ ایسے وقت میں لکھنے والا تخلیق کی رو کی بے راہ روی اور اپنی بے بسی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ یہ وقت ایسا ہی ہوتا ہے، جیسا ملاحوں کے لئے وہ وقت جب انہیں سرکش دھاروں کے بیچ سے اپنی ناؤ دوسرے کنارے پر لگانے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور ایسے ہی وقتوں میں لکھنے والوں کی صلاحیت اور مہارت کام آتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی مکمل ہو کر کاغذ پر اُتر آتی ہے اور لکھنے والا اسے تہہ کر کے رکھ بھی دیتا ہے، لیکن وہی کہانی دماغ میں دوسری شکلیں اختیار کرنے لگتی ہے۔ کبھی ایک کہانی سے زندگی کا ایک گوشہ نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ، دوسرا بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور پہلی کہانی سے دوسری کہانی پھوٹ کر نکل آتی ہے۔ دونوں کہانیاں بالکل الگ الگ ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔

یہ سارا عمل نہایت دلچسپ بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی لکھنے والے کے لئے بڑے کرب کا سبب بھی، جس سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ہر لکھنے والے کو خوشی ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر کہانی کی تخلیق کی ایک کہانی ہوتی ہے جو اگر لکھی جائے تو دلچسپ اور پر لطف مطالعہ کی چیز ہو سکتی ہے اور اس سے لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ یہ سارے تجربے کہانی لکھنے والے کے داخلی تجربے ہیں جنہیں اس وقت تک کوئی دوسرا انسان نہیں جان سکتا جب تک وہ خود ہی نہ بتائے کہ کسی کہانی کا خیال کس طرح پیدا ہوا اور وہ کس طرح بڑھتی گئی اور آخر کاغذ پر منتقل ہو کر پڑھنے والوں تک پہنچی اور اس عرصے میں کہانی لکھنے والے پر کیا کیا بیتی۔

ایک کہانی کی تخلیق کے سلسلے میں کہانی لکھنے والے کو کون سے عالم سے گزرنا پڑتا ہے، اس کی تفصیل پڑھنے والے جان جائیں تو حیرت میں پڑ جانا لازمی ہے۔ پڑھتے وقت اس معصوم شہزادے کا قصہ یاد آجائے جو خوبصورت تتلیاں پکڑنے کے شوق میں جنگل میں کھو گیا تھا اور جب واپس آیا تو اس کی جھولی میں چند خوبصورت تتلیوں کے پر تھے۔ یا ایک دو تتلیاں۔ کہانی لکھنے والے کا دماغ شہد کی مکھی کی طرح اس پھول پر بیٹھتا ہے۔ کبھی اس پتے پر اور کبھی کانٹوں سے الجھتا ہے، کبھی وہ خوشی سے جھوم اُٹھتا ہے اور وہ تنہا بیٹھا مسکراتا رہتا ہے، کبھی ذہن الجھ جاتا ہے اور اس کا دل بیٹھنے لگ جاتا ہے، کبھی اسے وحشت ہوتی ہے اور کبھی مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ تب ایک کہانی وجود میں آتی ہے۔

میں بات کو کچھ بڑھا چڑھا کے بیان نہیں کر رہا ہوں، ممکن ہے کہ کچھ لکھنے والوں کے تجربے مختلف ہوں۔ وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جو کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہانی مکمل کر کے اُٹھتے ہیں۔ زیادہ دنوں تک انہیں ذہنی الجھاوے میں رہنا نہیں پڑتا، لیکن عام طور پر ایک کہانی لکھنے والے کو خواہ کتنے ہی مختصر عرصہ کے لئے ہی سہی، لیکن ایک عالم سے گزرنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ کرب کا ہو یا مسرت کا۔ کہانی لکھنے والے کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔

میں نے بھی کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ اچھی ہیں یا بری۔ یہاں اس سے بحث نہیں، ممکن ہے کہ ان کہانیوں میں کوئی بات بھی نہ ہو۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ یہ کہانیاں کس طرح وجود میں آئیں۔ کس طرح کہانی لکھنے کی تحریک ہوئی اور کس طرح ذہن کام کرتا رہا۔ مشاہدہ، مطالعہ اور اس کا ردعمل —— پھر تخلیقی عمل —— اور کس طرح مختلف واقعات کی کڑیاں مل کر کہانی کی شکل بن گئیں۔ ایسا تو بہت ہی کم ہوا ہے کہ کوئی واقعہ اس طرح آیا ہو کہ اسے لکھ دینے سے ایک کہانی بن گئی ہو۔ کبھی کبھی تو یہ سوچ کر حیرت ہی ہوتی ہے کہ مختلف ٹکڑوں سے مل کر ایک علاحدہ کہانی کس طرح بن گئی۔ کہانی کے ہر ٹکڑے کو الگ الگ کر دیا جائے تو واقعتاً ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ الگ الگ ٹکڑے

تھے جن کو جوڑ کر ایک کہانی کی شکل دے دی گئی ہے۔

آج یہ تقریباً ناممکن ہے کہ برسوں پہلے لکھی ہوئی کہانی کے بارے میں صحیح تفصیل لکھی جاسکے۔ بالکل ممکن ہے کہ بہت سی باتیں یاد سے اُتر چکی ہوں۔ ان یادوں کی تہہ پر دوسری یادوں کی تہیں پڑ چکی ہوں اور وہ باتیں غلط سلط ہوچکی ہوں۔ ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہوجائے، پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ دوتین کہانیوں کے تخلیقی عمل کی تصویر کاغذ پر اُتر آئے۔

میری ایک کہانی ہے ''الاؤ'' یہ کہانی کرشن چندر کی فرمائش پر ''نئے زاویے'' کے لئے لکھی گئی تھی۔ بہار میں کسان تحریک کی ہلکی سی تصویر اس کہانی میں ملتی ہے۔ کرشن چندر کو ضد تھی کہ کہانی بہار کی کسان تحریک سے متعلق ہو۔ یوں بھی ایک تو میں پریم چند سے متاثر ہوں۔ دوسرے میرا بچپن گاؤں میں گزرا ہے، تیسرے بہار کی کسان تحریک سے بھی واقفیت تھی۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا میں ممبر تھا اور کسان تحریک کی رہنمائی پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے بہت سے واقعات کا علم تھا۔ زمیندار کسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے، کس طرح ان پر مظالم کرتے تھے اور اگر کوئی بات ہوجاتی تھی تو کس طرح سرکوبی کرتے تھے۔ میں نے کرشن چندر سے وعدہ کرلیا تھا، لیکن کوئی ایسا واقعہ میرے ذہن میں نہیں تھا جسے جیوں کا تیوں کاغذ پر منتقل کردیا جاتا اور کہانی بن جاتی۔ میرے لئے ایک بڑا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ واقعات تو بہت سے ذہن میں تھے، لیکن کہاں سے کہانی شروع ہو اور کہاں ختم ہو۔

ان دنوں میں انجمن ترقی اردو میں تھا اور رانچی میں قیام تھا۔ میرے ذہن میں ایک بہت پرانی تصویر ابھری، ایک بار میں شکار سے واپس آرہا تھا، میرے گاؤں کے پاس ہی ایک گاؤں ہے، ٹکاری——ٹکاری گاؤں میں صرف کسان ہی تھے۔ زمینداری مختلف زمینداروں کی تھی، لیکن وہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ گاؤں سے باہر پورب طرف ایک بہت بڑا میدان ہے، میدان کی زمین ذرا اونچی اور چورس ہے اور گاؤں کے سارے لوگ شام کو وہاں اکٹھا ہوتے ہیں۔ کوئی کھلیان لگا تا ہے۔ کبھی ادکھ پیڑنے کے لئے وہاں کل لگایا جاتا ہے۔ پاس کے کنوئیں پر کسان اپنی بھینسوں کو دھوتے ہیں۔ غرض کہ ہر کام اسی جگہ ہوتا ہے۔

میں نے شکار سے واپسی میں دیکھا تھا کہ ایک نوجوان لاؤ جلا کر بانس کو سینک سینک کر اور ایک درخت کی جڑ میں پھنسا کر سیدھا کررہا تھا۔

اس تصویر کے ذہن میں ابھرتے ہی کہانی کا آغاز ہوگیا، لیکن کہانی بڑھے تو کیسے اور اس میں واقعات کیا لائے جائیں۔ آج مجھے بالکل یاد نہیں کہ زمانہ سردی کا تھا یا گرمی کا، لیکن میں نے صرف چند آدمیوں کو اس آگ کے پاس اکٹھا کرنے کے لئے شروع سردی کا موسم بنادیا۔ اتنی بات تو ہوگئی، لیکن کہانی کیا بنے اور اسے کسان تحریک سے کس طرح جوڑا جائے۔ یہ سوال دماغ میں پیدا ہوا اور کہانی رک گئی اور اس ادھیڑ بن میں دوتین دن گزر گئے، لیکن جب دماغ کام کرنے لگتا ہے تو اپنے لئے راہیں نکالتا جاتا ہے اور اس طرح کہ کبھی کبھی خود بھی حیرت ہوتی ہے اور جب میں لکھنے بیٹھا تو ایک حصہ بڑی آسانی سے لکھ گیا۔ لوگ اکٹھا ہوتے گئے، باتیں ہوتی گئیں، کس طرح کی باتیں شروع ہوئیں۔ گاؤں کی باتیں روزمرہ کی باتیں اور یکا یک سوامی سجانند کا کردار ذہن میں ابھرا۔ سوامی جی سارے ملک میں کسان تحریک کے نیتا تھے۔ غیر معمولی انسان، تقریر کرتے تھے تو پورا مجمع جوش میں آجاتا تھا۔ ان کی تقریر کا ذکر آیا اور جو لوگ اکٹھا تھے ان میں بھی جوش پیدا ہوا جو لوگ کبھی کوئی جلسہ وغیرہ نہیں کرتے تھے ان کے لئے جلسہ جلوس کام سے زیادہ تماشہ ہے اور کچھ لوگ تو اپنی حالت سدھارنے کے لئے زمیندار اور پٹواری کے ظلم سے بچنے کے لئے جلسے کا پروگرام ذہن میں بنالیتے ہیں اور کہانی آگے بڑھنے لگتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہورہی تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ ٹکاری گاؤں کے کسان غریب ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد نیک بھی تھے۔ انہوں نے کبھی کسان تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ اتنے دبے ہوئے تھے کہ زمیندار کے خلاف کچھ بولنے کی ان میں ہمت ہی نہیں تھی۔

دوتین دنوں تک تو یہ حال رہا کہ قلم آگے بڑھنے سے انکار کررہا تھا اور میں کہانی مکمل کرنے میں بے بس تھا۔ کرشن چندر کے خط پر خط آرہے تھے اور میں ان کو الٹا سیدھا جواب لکھ کر مطمئن کررہا تھا۔ ان کو جلدی تھی اور یہاں یہ حال کہ کہانی مکمل ہی نہیں ہورہی تھی۔ ایسا وقت ہر لکھنے والے کے لئے کرب کا وقت ہوتا ہے، لیکن انہیں دنوں ایک پرانے

دوست آ گئے۔ یہ زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے،لیکن ذہن انقلابی تھا اور وہ کسان مزدور تحریک میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔انہوں نے محض ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک زمیندار اور اس کے پٹواری نے بیگار نہ دینے پر کسان کو نہیں بلکہ گاؤں کے سارے کسانوں کو کس طرح سازش کر کے شکنجے میں کس لیا اور ان کے کھلیان پر قبضہ کر کے پولیس کا پہرہ بٹھا دیا۔

میرے دوست تو قصہ بیان کرنے کے بعد چلے گئے،لیکن اس کہانی کو مکمل کرنے میں مجھے اس واقعہ سے بڑی مدد ملی، پھر تو سارے واقعات مرتب ہو کر ایک مکمل کہانی کی شکل میں سامنے آ گئے۔اس کے بعد کوئی دقت باقی نہیں رہی۔لکھنے بیٹھا اور کہانی مکمل کر کے بھیج دی۔

میری دوسری کہانی ہے ''دو مزدور'' آپ یقین کیجئے۔ یہ کہانی جیسے میری آنکھوں کے سامنے مکمل ہو گئی۔ بہار میں ایک ریلوے اسٹیشن ہے، بہٹا ـــــ وہاں ایک شوگر مل ہے۔میں بہٹا سے پٹنہ آ رہا تھا۔ گاڑی آنے میں دیر تھی، اسٹیشن پر چائے کا کوئی انتظام نہ تھا،لیکن اس سے باہر گندی سی سڑک کے کنارے ایک گندا سا ہوٹل تھا، میں چائے پینے اور وقت کاٹنے کے لئے اس ہوٹل میں گھس گیا۔ ہوٹل کی تصویر سے لے کر سارے واقعات بالکل آنکھوں کے سامنے گزرے اور ذہن میں نقش ہو گئے۔''دو مزدور''ایک جوان اور ایک بوڑھا،ایک وہ جو ہڑتال کی ناکامی کا شکار ہو چکا تھا اور ایک بالکل نیا نیا جس نے کبھی ہڑتال دیکھی نہیں تھی۔صرف یہ جانتا تھا کہ ہڑتال ایک حربہ ہے مزدور کے ہاتھ میں مالکوں سے اپنی مانگ پوری کرانے کا اور وہ بھی لیڈروں کی تقریریں سن کر۔ ہڑتال اس نے نہیں دیکھی تھی،لیکن بوڑھا مزدور ہڑتال کا سامنا کر چکا تھا اور اس کے تجربے عجیب تھے۔ ہڑتال کی ناکامی کے بعد خود کو پٹا ہوا محسوس کرتا تھا۔ایک کی ہمت جوان تھی اور دوسرے کی ہمت چور۔ یہ بڑا تضاد تھا جو کہانی لکھنے کا سبب بنا۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاید دماغ میں آتے ہی اتنی جلدی کوئی دوسری کہانی میں نے مکمل نہیں کی ہے۔بس یوں سمجھئے کہ جو کچھ دیکھا اسے کاغذ پر منتقل کر دیا اور کہانی مکمل ہو گئی۔بس الفاظ میرے ہیں، ورنہ ساری کہانی میں ایک لفظ کا بھی میں نے اضافہ نہیں کیا ہے۔

لیکن ـــــ سب سے عجیب وغریب کہانی ''نینا جوگن'' کی ہے۔میری ننہال میں، جہاں میں نے پرورش پائی تھی ایک لنڈ منڈ برگد کا درخت تھا جس میں ایک دو شاخ ہری تھی۔ درخت ایک النگ پر تھا نیچے ایک پین بہتی تھی اور ٹھیک جہاں پر یہ درخت تھا وہاں ایک بڑا گڈھا تھا، جس میں بہت دنوں تک پانی بھرا رہتا تھا۔صرف دو ماہ گرمیوں میں سوکھتا تھا۔ مشہور یہ تھا کہ اس درخت پر ایک چڑیل رہتی ہے اور ادھر سے اکیلے گزرنے والوں کو ڈبو کر مار ڈالتی ہے۔بچپن میں ایک بار اکیلا پھرتا ہوا وہاں چلا گیا تھا اور پاس کے ایک گاؤں کا حجام مجھے پکڑ کر گھر پہنچا گیا تھا۔میری ننہال چھوٹے،لیکن بااثر زمیندار گھرانے میں تھی، حجام نے جب مجھے گھر پہنچایا تو اسے انعام دیا گیا۔ایک بزرگ نے دعائیں پڑھ کر میرے بدن پر پھونکا، خیرات کی گئی اور سختی کے ساتھ مجھ سے کہا گیا کہ پھر ادھر کا خیال نہ کرو۔اس وقت میری عمر نو دس سال تھی، دل اور دماغ میں ایک کریدسی پیدا ہو گئی اور جاننے کی کوشش کی کہ چڑیل کون ہے اور لوگوں کو کیوں مار ڈالتی ہے،لیکن کچھ بھی پتہ نہ چلا اور اب تک کوئی نہ بتا سکا،لیکن وہ برگد کا درخت میرے دماغ کے ایک کونے میں محفوظ رہا۔ جب کہانی لکھنے لگا تو کئی بار اس برگد کے درخت اور اس چڑیل کی کہانی کو لکھنے کو کوشش کی،لیکن نہ لکھی گئی۔کئی بار لکھا اور پھاڑ کر پھینک دی، مگر سچا واقعہ ہے کہ برگد کا درخت اور بچپن کا واقعہ دماغ سے بالکل کبھی نہیں نکلا۔

۱۹۵۸ء میں برادرم وہاب اشرفی نے''صنم'' کا افسانہ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا اور میں نے کہانی لکھنے کا وعدہ کر لیا، اس کے بعد ان کا تقاضہ شروع ہوا تو میں نے سوچا کہ نئے ڈھنگ کا کوئی تجربہ کیا جائے، اس خیال کے ساتھ ہی نینا بڑ کا خیال ابھرا، میں نے سوچا کہ لوک کہانیوں کی قسم کی کوئی کہانی لکھی جائے،لیکن اس کی تعبیر واضح اور سماجی ہو، چنانچہ نینا ایک خانہ بدوش لڑکی کی تصویر میرے ذہن میں آئی، جس نے ایک راج کمار سے محبت کی اور اس کی سزا میں موت کے گھاٹ اُتری۔ حالانکہ وہ پاک دل تھی۔اس کی محبت پاک تھی، راجہ نے پہلے اسے کوئی راج کماری سمجھ کر اسے بہو بنانا منظور کر لیا تھا، لیکن جب معلوم ہوا کہ لڑکی راج کماری نہیں بلکہ خانہ بدوش سردار کی لڑکی ہے تو اسے نکال دیا اور چونکہ وہ

(بقیہ ص۵۶ پر)

وہاب اشرفی

گرگٹ کے خطوط

گل صحرا ——— پٹنہ۴

یکم جون۱۹۶۳ء

محتشمی کرشن چندر صاحب!

کورنش بجالاتا ہوں۔

ابھی ابھی آپ کی کہانی ''ہمالیہ کے سائے میں'' پڑھی۔ کہانی کاہے کو ہے، ایک شاہکار ہے۔ آپ کو بجا طور پر ایشیا کا عظیم افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں مبالغہ کا قائل نہیں، خواہ مخواہ کی تعریف و توصیف بھی میری عادت نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بہترین ادب کے دو چار افسانہ نگاروں میں آپ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ آپ اردو کی کہانیوں کی آبرو ہیں۔ آپ کی واحد ذات نے اردو کو وہ عزت اور توقیر بخشی ہے جو متقدمین سے متاخرین تک کی مجموعی کوششیں نہ کرسکیں۔ چین کے جارحانہ اقدام کو فن کارانہ طور پر کہانی کا روپ دے کر آپ نے اعلیٰ اور زندہ ادب بنادیا ہے۔ آپ نے واقعی یہ ثابت کردیا ہے کہ موضوع بذات خود کوئی چیز نہیں ہے، اصل شئے ٹریٹمنٹ ہے۔ تقابل خطرناک بات ہے، پر میں یہ کہوں گا کہ راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس یا یہاں کے اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی آپ کے گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ بھلا آپ کے نام کے ساتھ ان معمولی افسانہ نگاروں کے نام کیسے لئے جاسکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جذباتی ہورہا ہوں، لیکن میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند، اسی باعث اتنا کچھ لکھ گیا۔ گو کہ جانتا ہوں کہ ان افسانہ نگاروں میں کئی آپ کے دوست بھی ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ بہ حیثیت افسانہ نگار میرا نام آپ تک نہیں پہنچا ہوگا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں چار سال سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ چینی حملے سے میں بھی متاثر ہوا تھا، ایک کہانی ''دار اور رخسار'' اسی پس منظر میں ہوگئی تھی۔ ایک مقامی رسالے ''کنائے'' میں چھپی بھی تھی۔ اس سلسلہ میں اگر آپ اپنی رائے (چند جملوں میں سہی) بھیج دیں، تو آپ کا کرم ہو اور میں تازندگی آپ کا ممنون رہوں۔ کہانی منسلک ہے۔

احقر:

وحشی عظیم آبادی

گل صحرا ——— پٹنہ۴

یکم جون۱۹۶۳ء

مکرمی بیدی صاحب!

جئے گرنتھ

آپ کی کہانی ''ٹرمینس سے پرے'' باصرہ نواز ہوئی۔ میں آپ کے فن کا عرصہ سے قائل ہوں، یہی وجہ ہے کہ آپ کی کہانیاں ڈھونڈ، ڈھونڈ کے پڑھتا ہوں۔ آپ کی کم نویسی، ہم پرستاروں پر بڑا ظلم ڈھاتی ہے، لیکن آپ نے ثابت کردیا ہے کہ اعلیٰ اور زندہ ادب غور و خوض کے بعد ہی سنبھل سنبھل کر پیدا کیا جاسکتا ہے، ورنہ آپ کی کہانیوں کا بھی وہی حشر ہوتا، جو کرشن چندر کی زودنویسی کے باعث ان کی کہانیوں کا ہورہا ہے۔ کیا اس میں اب شبہ رہ گیا ہے کہ آپ ہی ایشیا کے سب سے بڑے کہانی کار ہیں۔ آپ اسے تحسین ناشناس نہ تصور کریں، تو میں یہاں تک کہوں گا کہ آپ دنیا کے دو تین عظیم ترین افسانہ نگاروں کی صف میں ہیں۔ آپ نے اردو کو اپنی کاوشوں سے مالامال کردیا ہے۔ ایک ''ٹرمینس سے پرے'' ہی کو لے لیجئے راکھی کے روایتی رومانی تقدس پر کیسی کیسی دھیمی دھیمی آنچ آتی ہے۔ حق ہے کہ سگی بہن اور راکھی والی بہن کا فرق زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عنوان میں جو جدت ہے، وہ غور طلب ہے۔

آپ ہنگامی موضوعات پر کہانی نہیں لکھتے، یہ بڑا سوچا سمجھا موقف ہے۔ بھلا ہر ادنیٰ موضوع کیسے کہانی بن سکتا ہے۔ (مگر کرشن جی کو کون سمجھائے)

کہانی کار کی حیثیت سے میرا نام آپ کے لئے نیا سہی، لیکن میں کئی برسوں سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک مطبوعہ کہانی ''چکر میں ہے یہ زمیں'' ملفوف ہے۔ ازراہ کرم اس کہانی کے بارے میں چند سطریں لکھ بھیجئے، میں تاحیات آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

کمترین
وحشیؔ عظیم آبادی

گل صحرا ——— پٹنہ۴
یکم جون ۱۹۶۳ء

محترم خواجہ صاحب! لال سلام

مزاج اقدس......؟ آپ کی کہانی ''لہو پکارے گا......'' نظر نواز ہوئی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک بہت بڑا صحافی، ایک بہت بڑا ادیب بھی کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کی شخصیت میں جو تہہ داری اور لچک ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی صحافتی مصروفیت اور ہنگامی زندگی چاول پر ''قل ھواللہ'' پڑھنے کی اجازت کیسے دیتی ہے؟ میں اَن پڑھ سہی، پر بہانگ دہل کہوں گا کہ آپ کی کہانیوں میں زندگی کی جولہک ہوتی ہے، وہ کرشن اور بیدی کے یہاں معدوم ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ کل کا نقاد یہی فیصلہ صادر کرے گا کہ آپ دنیا کے بہترین افسانہ نگاروں میں ایک ہیں۔

مقابلہ مقصود نہیں...... پر آپ ہی بتایئے کہ آپ کے سوا ایشیا کا کون افسانہ نگار ہے، جو صحافت کو ادب میں اس طرح مدغم کردے کہ دونوں ایک دوسرے کے جزو لاینفک بن جائیں۔ سچ ہے کہ سچا ادب، سچی شاعری اور سچی کہانی وہی ہے، جو عوامی ہے۔ مجھے یہ کہہ دینے میں ذرا تامل نہیں کہ آپ کا منفرد رنگ کرشن اور بیدی کے مقابلہ میں ہر طرح ممتاز ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ آپ مجھے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں جانتے ہوں گے، لیکن میں کئی برس سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک چھپی ہوئی کہانی ''مرثیہ......'' اسی خط کے ساتھ نتھی ہے۔ ازراہ کرام اسے پڑھ لیں اور دو سطور اس باب میں لکھ بھیجیں۔ میرے لئے آپ کی تحریر، سند کا کام کرے گی۔ میں عمر بھر آپ کی نوازش کے بوجھ تلے دبا رہوں گا۔

خاکسار ——— وحشیؔ عظیم آبادی

گل صحرا ——— پٹنہ۴
یکم جون ۱۹۶۳ء

مخدومی و مکرمی اختر اورینوی صاحب!

دام الطافکم

مزاج شریف قبلہ و کعبہ ———؟

میں نے فوراً آپ کی کہانی ''ہیلی پیڈ'' پڑھ کے ختم کی ہے۔ اس سے پہلے اسی موضوع پر کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کی کہانیاں زہر مار کر چکا ہوں ——— ان کی کہانیاں ''ہمالیہ کے سائے میں'' اور ''لہو پکارے گا......'' پڑھ کر بے حد مکدر ہوا تھا۔ ''ہیلی پیڈ'' نے بڑا ریلیف کا کام کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کرشن اور خواجہ کی شہرت کے اسباب کیا ہیں؟ اور انہیں کس جہت سے افسانہ نگار ہونے کا سرٹیفکیٹ ملا ہے؟ اُوٹ پٹانگ کچھ لکھ دینا ہی کہانی نہیں ہے۔ چین کے جارحانہ اقدام نے ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ بھلا ''ہمالیہ کے سایہ میں'' بھی کوئی کہانی ہوئی ——— نہ کوئی زندہ کردار، نہ ہی واضح پلاٹ۔ کھردرا اسلوب ——— لعنت ہے ان پر جو ایسے افسانہ نگار کو ایشیا کا بڑا افسانہ نگار مانتے ہیں اور خواجہ صاحب بھی خوب ہیں کہ خود کو پانچ سواروں میں گنتے ہیں۔ بھلا حماقت کا ادب سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ کہانی لکھنا چاول پر آیت کریمہ لکھنے کا کافن ہے اور صحافت ہل چلانا ہے۔ ایسے میں ان کی کہانی ''لہو پکارے گا۔'' پڑھ کر مجھے جو تکدر ہوا وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں، پر ''ہیلی پیڈ'' نے موڈ ساز گار کیا۔ آپ نے واقعی موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔ خدا گواہ ہے جو پیتھوس اس کہانی میں مجھے نصیب ہوا، کم کہانیوں میں ملا ہے۔

بیشک آپ کی یہ کہانی آپ کو ایشیا کے (بلکہ دنیا کے) چند گنے چنے افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ آپ واقعی امر ہوگئے ہیں۔ کسی حدتک میں بیدی کے فن کا قائل تھا، لیکن آپ کی جادواں کہانیوں کے آگے ان کا فن بھی طفلانہ معلوم ہونے لگا ہے۔

ہاں خوب یاد آیا ——— آپ کے دوست سہیلؔ عظیم آبادی بھی خیر سے افسانہ نگار ہی ہیں۔ کل ان کی کہانی ''عجائب خاں'' پڑھی۔ کہنے کو تو یہ کہانی ہے، لیکن سچ پوچھئے تو دنیا کا نیا عجوبہ ہے۔ چلے تھے صاحب اردو افسانے کو ایک نیا کردار دینے اور کر گئے رطب و یابس میں

اضافہ ــــــ ان سے کہئے کہ پہلے قاعدہ بغدادی اور اردو کی پہلی کتاب کی منزل سے آگے بڑھیں۔ تو بہ ان کی زبان پانچویں درجے کے طالب علم کی زبان ہے۔ بس یہی کہ نہر پر چل رہی ہے پن چکی۔ ذرا انشاء میں زور تو ہو، کچھ جو شیلے، بھڑ کیلے الفاظ تو ہوں، کچھ زبان میں رنگ و روغن کی کیفیت تو ہو۔ یہ کیا کہ سامنے کے پٹے پٹائے معمولی الفاظ لئے اور کہانی لکھ دی۔ گویا کہانی لکھنی نہ ہوئی، گھوڑے پر مضمون لکھنا ہوا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ سہیل صاحب افسانہ نویسی ترک کر کے، کسی مدرسے کے مولوی ہوجاتے۔ بتایئے تو آج جب کہ ''ہیلی پیڈ'' جیسی لافانی کہانی لکھی جارہی ہے، تو پھر ''عجائب خاں'' کی کھپت کہاں ہوگی۔ ان کا فن تو بقول شخصے ''رام بھروسے آنکھ ملتے اُٹھا'' کی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ حضرت بے حد بور کرتے ہیں اور اپنا رشتہ پریم چند سے جوڑتے ہیں، لیکن چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

شاید آپ کے علم میں ہو کہ میں بھی دس بیس کہانیاں تین چار برسوں میں لکھ چکا ہوں۔ ایک تازہ کہانی جو پٹنہ ریڈیو سے براڈ کاسٹ بھی ہوئی ہے ''ایک اینٹ، ایک پتھر'' بھیج رہا ہوں۔ آپ کا احسان ہوگا اگر آپ اپنی قیمتی رائے اس کہانی کے بارے میں لکھ بھیجیں۔

بے مایہ

وحشی عظیم آبادی

گل صحرا ــــــ پٹنہ۴

یکم جون ۱۹۶۳ء

جناب سہیل صاحب!

آداب

ابھی ابھی آپ کی کہانی ''عجائب خاں'' پڑھی ہے یوں تو آج کل کہانی کاروں کی بھیڑ چال ہے، لیکن آپ کا ممتاز منفرد رنگ کسی کور چشم سے ہی اوجھل رہ سکتا ہے۔ کہنے کو تو کرشن چندر بھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ حضرت شاعری کرتے تو زیادہ مناسب بات ہوتی۔ ان کے یہاں پلاٹ میں جو ناہمواری رہتی ہے، وہ مجھے بے حد کھٹکتی ہے، خواہ مخواہ کی بکواس ان کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کی کہانیوں کا کوئی کردار بھی جاوداں نہیں بن سکا۔ دراصل کسی کیریکٹر کے خدوخال کا اُجاگر کرنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے ــــ اور بیدی کے یہاں اگر پلاٹ کی ناہمواری ہے، تو بیان کا کھردرا پن بھی ہے۔ انہوں نے شاید عزم کر لیا ہے کہ اردو کو پنجابی بنا کر ہی دم لیں گے، پھر ان کی دور از کار تلمیحات طبیعت کو منغض کردیتی ہیں۔ ان کا اسلوب سڑک پر روڑے بچھانے کا اسلوب ہے۔ خواجہ صاحب پر تو خواہ مخواہ افسانہ نگاری کا الزام ہے وہ انشائیہ نگار ہوتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ ان کی صحافت انہیں کہیں جمنے نہیں دیتی۔ انہوں نے افسانے اور مضمون کی سرحدیں ایک دوسرے میں ضم کردی ہیں۔ ان کی کہانی پڑھتے وقت اکثر کوئی روئیداد کا سپاٹ اور سطحی بیان معلوم ہوتا ہے۔ گویا افسانہ نویسی نہ ہوئی خبروں کی رپورٹنگ ہوئی ــــ اور آپ کے اختر اور رینوی ایک الگ مصیبت ہیں۔ پوری ڈکشنری از بر کئے بیٹھے ہیں اور ڈکشن کسے کہتے ہیں بچارے جانتے ہی نہیں۔ اف رے یہ اسٹائل۔ جیسے لکھتے ہوں ''وہ کم مایہ خاک روب چرمی جوتے، دائمی قدروں کے حامل تلاش کر رہا تھا'' یعنی بھاری بھرکم الفاظ اینٹھتے اتراتے چق مق کرتے کردار، خوامخواہ کی بے ہنگم طوالت اور رینوی کے افسانوں کے اہم عناصر ہیں۔ اب آپ ہی انہیں بتادیں کہ کہانی کاری ایک کومل اور نازک فن ہے۔ اس کے لئے لطیف جذبات اور محسوس کئے ہوئے تجربوں کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک دھیمی دھیمی پرکشش ابتدا ہوتی ہے جو اپنے کردار کے نقوش واضح کرتی ہوئی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے، یہاں تک کہ ایک پر اثر نقطہ عروج پر اس کا اختتام ہوجاتا ہے۔

بے شک آپ اردو کہانیوں کے ممتاز ترین اسکول ہیں۔ آپ کا دھیما دھیما لہجہ پریم چند کی روایت کی ارتقائی صورت ہے۔ آپ کا بے تکلف سادہ انداز بیان بے حد پرکشش ہے۔ آپ عوام کے لئے لکھتے ہیں، اسی لئے حددرجہ آسان اور تکلف سے عاری زبان کے استعمال پر جو قدرت آپ کو ہے، وہ پریم چند کو بھی نصیب نہیں تھی۔ مجھے مبالغہ سے ہمیشہ چڑ رہی ہے، لیکن مجھے یہ کہنے میں شرم نہیں کہ آپ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور دنیا کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں ایک ہیں، اس لئے کہ ماجرا نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے مشکل فن پر آپ کا بلاشرکت غیرے قبضہ ہے۔ ایک ''عجائب خاں'' کو ہی

لے لیجئے۔ کیا اس سے بہتر کہانی اردو یا کسی دوسری زبان میں لکھی گئی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میرا نام آپ کے لئے نیا ہوگا، لیکن میں چار سال سے مسلسل کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ ایک مطبوعہ کہانی ''کوئی غمگسار کیوں ہو'' خط کے ساتھ نتھی ہے۔ ازراہ کرم اپنی گراں قدر رائے سے نوازیئے تاکہ مزید لکھنے کا حوصلہ ہو۔

نیازکیش

وحشیؔ عظیم آبادی

گل صحرا ——— پٹنہ۴

۱۶ جنوری ۱۹۶۳ء

محبی زکی انور!

میری یہ شکایت مہمل ٹھہری کہ بڑے افسانہ نگار، نئے لکھنے والوں کو نہیں پوچھتے۔ میری کہانیوں کا مجموعہ ''ایک نقش وحشیؔ'' زیر ترتیب ہے۔ تمہیں یہ جان کر مسرت ہوگی (اوروں کو دکھ ہوگا) کہ اس کی اشاعت کی خبر (جو ایک رسالہ میں چھپی ہے) پڑھ کر کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ اتنے خوش ہوئے کہ میری کہانیوں کے بارے میں (بغیر میری خواہش کے) اپنی رائیں بھیجی ہیں، حالانکہ میں نے ہمیشہ ان خودساختہ بڑوں کی کہانیوں کو ان کے سامنے ہی کنڈیم کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان نام نہاد بڑوں کی رائیں اپنی کتاب میں شامل کروں، لیکن یہ سوچ کر کہ ان کے احساسات مجروح ہوں گے، شامل کر رہا ہوں۔

مخلص

وحشیؔ عظیم آبادی

(ماہنامہ ''راوی'' پٹنہ، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۳۹ تا ص ۴۳)

❀❀❀

کہانیوں کی کہانی (ص ۵۲ سے آگے)

راج کمار کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی، اس لئے اسے موت کی سزا ملی۔

راجہ نیک ہے، راج کمار نیک اور اچھا، لڑکی کا باپ بھی اچھا، لیکن غریب لڑکی کو مر کر بھی چین نہ ملا چڑیل کہلائی۔ کہانی کس طرح مرتب ہوئی۔ ایک الگ کہانی ہے۔ نینا جوگن کا کوئی وجود نہیں تھا، صرف نینا بڑ کے نام سے نام ملا۔

انہیں دنوں ایک فلم دیکھی تھی جس میں ایک خانہ بدوش لڑکی کی ایک دولت مند لڑکے سے محبت دکھائی گئی تھی۔ فلم میں تو تھا کہ وہ لڑکا بھی خانہ بدوشوں میں مل گیا، مگر جلد ہی اس لڑکی سے سیر ہو کر بھاگ نکلا اور لڑکی اس کی تلاش میں شہر شہر ماری پھری اور آخر میں طوائف بن گئی، لیکن اس کہانی میں راج کمار اسے اپنے محل میں لے آیا اور رانی بنا کر رکھا، لیکن لڑکی کے باپ نے فریاد کی اور راجہ نے اسے نکلوا دیا اور وہ افسوسناک موت مری۔

کہانی تو خیر مکمل ہوئی، شائع ہوئی۔ سارے کردار کس طرح اکٹھا ہوئے اور کہانی کتنے ٹکڑوں سے اور کتنے عرصے میں بنی اسے صرف میں ہی جانتا ہوں۔ اس گاؤں میں کبھی کوئی راجہ نہیں تھا راجہ کا کردار مجھے بچوں کی ایک کہانی سے ملا تھا اور نینا خانہ بدوش لڑکی کا کردار فلم دیکھنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ مزار اس گاؤں میں موجود ہے، لیکن وہ گاؤں سے باہر نہیں بلکہ گاؤں کے اندر ہے۔

کہانی کتنی بار دماغ میں بنی اور بدلی۔ کہانی تو مکمل کرنے میں کم سے کم دس دن لگ گئے۔ وہ شائع ہو چکی ہے، لیکن پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ کہانی تشنہ رہ گئی ہے۔

اگر ہر کہانی کی مکمل کہانی لکھی جائے تو واقعہ یہ ہے کہ کہانی کی کہانی اصل کہانی سے کئی گونا طویل ہو جائے اس لئے میں نے اپنی تین کہانیوں کی مختصر سی کہانیاں لکھ دی ہیں اور عمداً ان تفصیلات سے گریز کیا ہے جو سامنے آتی رہی ہیں۔ (ماہنامہ ''راوی'' پٹنہ، مئی ۱۹۶۳ء، ص ۳ تا ص ۵ اور جون، ۱۹۶۳ء میں ۳ تا ص ۶ و ص ۱۷) ❀❀

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

منظومات

علیم اللہ حالیؔ
208, Abu Fakhruddin Plaza, Langartoli, Patna 800004

صبا کو ایک مشورہ

صبا! خطۂ غیر ذی زرع میں تو کہاں آ گئی ہے؟
پگھلتے ہوئے
آگ اُگلتے ہوئے ریگ زاروں میں
تیری صباحت کے قدموں میں بھی
آتشیں سرزمیں تیشۂ دردکا
زہر بھرنے لگے گی
تیرے نرم شبنم فشاں عارضوں پر
شعاعوں کی ضربیں پڑیں گی
تیرے رُخ پہ سرخ اور نیلی
لکیریں ابھر کر تیرا حسن غارت کریں گی
تو پھر یوں کہ
ویراں ریگستاں کو اپنے ہی آتش زدہ
مہر آلودہ تقدیر پر چھوڑ دو
صبا لوٹ جاؤ

❁❁❁

علی شاہد دلکش
Deptt. Of Computer Science & Engineering
Cooch Behar, Govt. Engineering College,
Behar - 736170 (Mob. 8820239345)

آئینہ

اگر
آپ ادیب وشاعر ہیں
تو ادب کا مظاہرہ کریں
حسن اخلاق سے
شعور سے، تقریر سے، تحریر سے
ورنہ...... یہ جان لیں!
بے ادب قلم کار
مجروح کرتے ہیں
گفتار کو، کردار کو، وقارِ فن کو
حرمت قلم کو
معراج انسانیت کو
یہ تلخ حقیقت ہے
کہ قلم بڑی نعمت ہے
خدا کی
کیونکہ
بے ادب بے نصیب!
با ادب بانصیب

❁❁❁

غزلیں

مدہوش بلگرامی

224, Bahera Saudager East, Hardoi - 241001
(Mob. 9696778136)

تو جو چاہے کمال دے مجھ کو
سیدھے رستے پہ ڈال دے مجھ کو

یادِ ماضی ، نہ فکر مستقبل
حال ہی حسب حال دے مجھ کو

منتظر میں مسرتوں کا ہوں
تیری مرضی ملال دے مجھ کو

میرے دشمن تو باشعور نہیں
دوست ہی خوش خصال دے مجھ کو

جس کا کوئی جواب دے نہ سکے
کوئی ایسا سوال دے مجھ کو

خوشبوؤں سا بکھرنے والا ہوں
خاک داں سے نکال دے مجھ کو

دھوپ نیزے ہوں بے اثر مدہوشؔ
عزم کی ایسی ڈھال دے مجھ کو

سیفیؔ سرونجی

"Intesab Aalami" Quarterly, Saifi Library, Sironj - 464228
(Madhya Pradesh) (Mob. 9425641777)

دلوں کے فاصلے دل سے مٹانا چاہتے ہیں
ہم اپنا گھر خلاؤں میں بنانا چاہتے ہیں

تمہارے پاس بیٹھے ہیں نئی پوشاک پہنے
امیر شہر سے رشتہ بڑھانا چاہتے ہیں

زمیں ہے سرخ اور تپتی ہوئی ہے ریت ، پھر بھی
ہمارا شوق ہے پاؤں جلانا چاہتے ہیں

قلم کردو ہمارے ہاتھ ، یہ طاقت ہے تم میں
ہم اپنے بازوؤں کو آزمانا چاہتے ہیں

ہمارے نام سے نفرت بہت ہے تم کو ورنہ
کسی کا دل بھلا ہم کب دُکھانا چاہتے ہیں

تم اپنے شہر کی اپنی سیاست پاس رکھو
ہم اپنے گاؤں کو اس سے بچانا چاہتے ہیں

مصداق اعظمی

Jawman, Mejwan, Phulpur, Dist- Azamgarh - 276304 (Mob. 9451431700)

غزلیں

زبانی ہی سہی آ جاؤ دے دوں
تمہارے دل پہ کوئی گھاؤ دے دوں

اسی منظر کا کب سے منتظر ہوں
چڑھے دریا تو اپنی ناؤ دے دوں

کشش کوشش کی پھر بھی کم نہ ہوگی
اگر کوشش کا اپنی داؤ دے دوں

رکو اس تختۂ دار و رسن پر
ذرا مونچھوں کو اپنی تاؤ دے دوں

کسی کردار میں وسعت نہیں وہ
کہانی کو جو میں پھیلاؤ دے دوں

کروں تقسیم خود کو اس سے پہلے
ریاست دل کی تم کو آؤ دے دوں

کوئی میری طرح جینا تو چاہے
میں اپنے سب ہنر سب داؤ دے دوں

غلاموں کی طرح مصداقؔ کیسے
میں اپنی فکر کو ٹھہراؤ دے دوں

❁❁❁

ہم پر صاحب بوجھ جو سب سے بھاری ہے
ہلکی پھلکی شاید جیب ہماری ہے

تیری بزم سے اُٹھ کر اب معلوم نہیں
کس محفل میں جانے کی تیاری ہے

کعبے کی مسماری سے بڑھ کر صاحب
کہتے ہیں انسان کی دل آزاری ہے

توڑے دئے جانے کے ڈر سے چپ کیوں ہیں
آئینوں کی اپنی ذمہ داری ہے

میری نظر میں ساتھ سروں سے بھی بڑھ کر
چھوٹے چھوٹے بچوں کی کلکاری ہے

پھولوں جیسی باتیں کرنے والوں کے
لہجے یں شامل تھوڑی چنگاری ہے

چپ رہ کر بھی سب کچھ کہہ لینے والے
جادوگر آنکھوں کی یہ فنکاری ہے

صحراؤں کے ہوش اُڑا دے گی مصداقؔ
دل کے گلشن پر جو وحشت طاری ہے

❁❁❁

غزلیں

عمران عظیم
B-322, Gali No. 5, Mandawali, Fazalpur,
Delhi - 110092 (Mob. 9312340686)

کام آئی نہیں اب تو دریا کی روانی بھی
ہے پیاس بھی شدت کی اور دور ہے پانی بھی

کچھ اپنی کہی ہوتی ، کچھ میری سنی ہوتی
اے کاش ہوئی ہوتی کچھ بات زبانی بھی

باہر کا کوئی منظر بھائے گا ان آنکھوں کو
گھر سے تو ذرا نکلو اب رُت ہے سہانی بھی

فریاد کرے کس سے کوئی بھی یہاں آکر
آنکھوں میں کہاں باقی اب میری ہے پانی بھی

مہمان ترے گھر میں ہر روز رہیں گے اب
آئیں گے بہت رشتے بیٹی ہے سیانی بھی

چہرے کو تر و تازہ کرنے کو بہت ہے یہ
خوشبو تو بہت دے گی اب رات کی رانی بھی

حیران ہوا ہوں اب اس بات کو سن کر میں
سنتے ہیں یہیں پر ہے وہ دشمن جانی بھی

دیکھا ہے بہت ہم نے پایا ہی نہیں کوئی
عمرانؔ کہاں اپنا اس شہر میں ثانی بھی

❁❁❁

سرورؔ نگینوی
Mohalla Kotrah, Nageena, Dist. Bijnor - 246762
(Mob. 9568048052)

ہم نے اشکوں کو بہایا دیر تک
دیکھ کر وہ مسکرایا دیر تک

ہچکیاں لیتا رہا بیمار غم
چارہ گر لیکن نہ آیا دیر تک

بند کمرے میں بہت رویا ہوں میں
تیری یادوں نے ستایا دیر تک

ہاتھ تو بیٹی کے پیلے ہوگئے
باپ نے قرضہ چکایا دیر تک

پھول مٹی میں لئے بیٹھا رہا
اُس نے خوشبو کو چھپایا دیر تک

چھت پہ اُس کو دیکھنے کے واسطے
اک کبوتر پھر اُڑایا دیر تک

آگئے دشمن بھی آنسو پوچھنے
دوستوں نے جب رُلایا دیر تک

چھاگئی پیپل پہ پھر آکاس بیل
وہ مجھے پھر یاد آیا دیر تک

حسرت سرورؔ تھی یا وہ شعر تھا
مطربہ نے گنگنایا دیر تک

❁❁❁

مشتاقؔ سیوانی

Khajoor Banna, Pathar ki Masjid, Patna - 800006 (Mob. 9304693513)

غزلیں

نظامِ میکدہ کیا ہے سمجھ پاتا نہیں کوئی
بھرے ہیں جام، لیکن جام چھلکاتا نہیں کوئی

چمن کے صحن میں اب پھول بھی ہنستا نہیں کوئی
سرِ محفل خوشی کے گیت بھی گاتا نہیں کوئی

محبت میں تو کہہ دینا بڑا آسان ہے لیکن
ستارے آسماں سے توڑ کے لاتا نہیں کوئی

یہاں دعویٰ تو کرتے ہیں سبھی عقدہ کشائی کا
مسائل جب اُلجھتے ہیں تو سلجھاتا نہیں کوئی

قسم کھاتے ہیں سب اک ساتھ جینے اور مرنے کی
لحد میں ساتھ میت کے مگر جاتا نہیں کوئی

یہاں نفرت نے بدظن کر دیا انساں کو انساں سے
کسی کی بے بسی پہ اب ترس کھاتا نہیں کوئی

مجھے معلوم ہے مشتاقؔ اس مطلب کی دنیا میں
صلہ اپنی وفاؤں کا کبھی پاتا نہیں کوئی

❁❁❁

جہاں ذکرِ حسن و جمال آ گیا ہے
تصور میں تیرا خیال آ گیا ہے

اُبھرتا نہیں میرا عکسِ محبت
ترے دل کے شیشے میں بال آ گیا ہے

مرے دل میں اُٹھنے لگی گدگدی سی
کسی کا پیامِ وصال آ گیا ہے

ترے حسن کی بھیک لینے کی خاطر
فلک سے اُتر کر ہلال آ گیا ہے

بہلتا نہیں ہے تری یاد سے دل
تری دید کا اب سوال آ گیا ہے

عجب رنگ ہے آج بزمِ سخن کا
سخنور کوئی باکمال آ گیا ہے

نہیں باز آتا ہے ظلم و ستم سے
ستم گر کا شاید زوال آ گیا ہے

شبِ ہجر مشتاقؔ کیسے کٹے گی
سرِ شام دل کو ملال آ گیا ہے

❁❁❁

سید عمانؔ حسین
Bihar Sharif, Nalanda - 803101 (Mob. 9304478525)

غزل

ویران پڑا ہے جو وہ گھر دیکھ رہا ہوں
جانے کا ترے آج اثر دیکھ رہا ہوں

آنگن میں تجھے اپنے مگر دیکھ رہا ہوں
جیسے کہ میں صحرا میں شجر دیکھ رہا ہوں

بلبل کو ہے اب قید میں جینا یہ سمجھ لے
صیاد کی ترچھی میں نظر دیکھ رہا ہوں

ہر شام سر بام ٹہلتی ہے حسینہ
بچ پائے گا کیسے یہ شہر دیکھ رہا ہوں

ہے لوگ ہزاروں جو تجھے دیکھ رہے ہیں
میں گل پہ تیری ٹھہری نظر دیکھ رہا ہوں

دل تیر سے زخمی ہے ، مگر درد نہیں ہے
قاتل کی ادا اُس کا ہنر دیکھ رہا ہوں

تنہا ہوں سفر پہ ، ہے محض چاند کا سایہ
مل جائے کوئی راہ گزر دیکھ رہا ہوں

جانے سے تیرے حال ہے افسردہ یہ دل کا
صحرا میں کبھی دشت میں گھر دیکھ رہا ہوں

جس طرح نشے میں کوئی محبوب کو دیکھے
میں رات کا جاگا ہوں سحر دیکھ رہا ہوں

اس عشق میں مجنوں کی قبا اوڑھ لی ہم نے
لیلیٰ ہے کدھر اور کدھر دیکھ رہا ہوں

عمانؔ نے غزلوں میں لیا نام جو تیرا
ہے ذکر تیرا اب میں جدھر دیکھ رہا ہوں

❁❁❁

اشعار
حافظؔ مشکی پوری

اگر انسان کامل ہو تو برتر ہے فرشتے سے
وگر نہ آدمی حیوانِ ناطق کے سوا کیا ہے؟

جہاں پر عقل کی حد رسائی ختم ہوتی ہے
وہیں سے ابتدا ہوتی ہے راہِ عشق و اُلفت کی

اِن ہی دو فقروں میں کر دوں گا حسابِ حشر صاف
میں سراپا جرم ہوں مالک مجھے کر دے معاف

جوانی تک فقط ہے آن باقی حسن صورت کی
مگر مرنے پہ بھی رہتی ہے شہرت حسن سیرت کی

کیا نذر انہیں دیجئے ، ہر چیز ہے ناچیز
سر ہیچ ، جبیں ہیچ ہے ، دل ہیچ ، جگر ہیچ

فتنۂ حشر کے اُٹھنے کی خبر کیا اُس کو
جس کی آنکھوں میں سماں ہو تری انگڑائی کا

خدا کا گھر بنانا ہے اِسے حافظ تو پھر پہلے
نکالو ہر بت پندار کو تم کعبۂ دل سے

شیراز کا میں ہوتا تو ہوتی مری بھی قدر
قسمت کو کیا کروں کہ ہوں حافظؔ بہار کا

نام کتاب	:	ہمارے تبصرے
مصنف	:	ڈاکٹر محمد مظاہر الحق
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۵ء صفحات : ۲۲۴
قیمت	:	۵۰۰ روپے
مبصر	:	پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے زرخیز ہونے کے ساتھ ساتھ مردم خیز بھی واقع ہوئی ہے۔ یہاں بے شمار ایسی شخصیات ہمیشہ منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوتی رہی ہیں جنھوں نے اپنی جگر کاہی اور ژرف نگاہی سے علم وادب، شعروسخن، بحث وتحقیق اور نقد وتبصرہ کے شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور اپنی علمی کاوشوں اور نگارشات کے ذریعے بہار کا نام قومی اور عالمی سطح پر روشن کیا ہے۔ ان مایہ ناز شخصیتوں میں ایک ڈاکٹر محمد مظاہر الحق صاحب بھی ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کا شمار اردو ادب کے محققوں، نقادوں اور تبصرہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی علمی وتحقیقی کاوشوں اور تبصرہ نگاری کے ذریعہ اردو ادب کو وقار اور امتیاز عطا کیا ہے اور مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں جن میں ''مطالعات''، ''مقالات نو''، ''حکیم لطیف احمد اور ان کی تاریخ گوئی''، ''شان بہار'' اور ''ہمارے تبصرے'' جیسی قیمتی کتابیں شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کو اردو زبان وادب کی گرانقدر خدمات پر متعدد اداروں کی جانب سے ایوارڈز سے بھی نوازا جاتا رہا ہے جن میں ''اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ'' (بہار و جھارکھنڈ) ''کلیم اللہ کلیم دوست پوری اردو ادب ایوارڈ''، ایوارڈ ''علمی مجلس''، بہار ''اردو انمول رتن ایوارڈ'' منجانب آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس، حیدرآباد، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ''ادارہ فکر ونظر'' سہسرام اور بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے ''پروفیسر عبدالمغنی ایوارڈ'' اور ''اختر اور ینوی ایوارڈ'' کے علاوہ ''اردو شاعری کا احتجاجی شعور''، ''مطالعات'' اور ''مقالات نو'' پر بہار اردو اکادمی، پٹنہ کا نقد انعام نیز بہار ہندی ساہتیہ سمیلن، پٹنہ کا ''سہ بھا گیتا پرمان پتر'' شامل ہے۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے شعروسخن، علم وادب، بحث وتحقیق اور تنقید وتبصرہ نگاری کو اپنی کاوشوں کا میدان بنایا ہے اور ان میں اپنی ایک پہچان وشناخت قائم کی ہے۔ وہ قدرتی طور پر عبقری شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کا کوئی ایک پہلو نہیں، بلکہ ان کی ذات مختلف پہلوؤں اور جہتوں پر محیط ہے۔

زیر نظر کتاب ''ہمارے تبصرے'' تبصرہ نگاری پر ان کی ایک معرکتہ الآراء کتاب ہے۔ ایک طرف یہ کتاب سیکڑوں کتابوں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتی ہے اور ان کتابوں کا مناسب مقام ومرتبہ متعین کرتی ہے تو دوسری طرف اردو کے نوخیز طلبا و طالبات کو تبصرہ نگاری کا طریقہ اور سلیقہ بھی سکھاتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت دوچند ہوجاتی ہے۔ وہ خود کتاب کے پہلے مضمون ''اور میں مبصر بن گیا'' میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ مفید تھا۔ تبصرہ نگاری ادبی تنقید کی ایک شکل ہے، جس میں کتاب کے مواد اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے، لہٰذا تبصرہ کرتے وقت مبصر کو سنجیدگی اور ذمہ داری کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔''
>
> (ہمارے تبصرے، ص ۹)

اس کتاب کے ذریعے نئی نسل کو تبصرہ نگاری کے علمی وادبی پہلوؤں سے

روشناس ہونے میں یقیناً کافی مدد ملے گی۔اس کتاب کی زبان نہایت سلیس اور سہل ہے۔ان کا پہلا تبصرہ حلیمہ فردوس کی کتاب ''ماشاءاللہ'' پر ہے جو یقیناً ماشاء اللہ کہنے کے قابل ہے، اس لئے کہ جس انداز اور اسلوب میں انہوں نے اس کتاب کا تعارف کرایا ہے اور مصنفہ کے قلم کی خوبیوں سے روشناس کرایا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔اس تبصرہ کا ایک اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

''حلیمہ فردوس کا مشاہدہ وسیع ہے۔ان کی نگاہ باریک بین ہے جو سماج میں پھیلی تمام برائیوں کا احاطہ کر لیتی ہے اور اسے ان کا قلم اپنے مخصوص انداز میں صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے جسے پڑھ کر قاری قہقہہ لگاتے لگاتے چونک پڑتا ہے.....حلیمہ فردوس کی زبان عام فہم سلیس اور رواں ہے۔ انہوں نے محاورے اور ضرب المثل کو جس چابک دستی سے استعمال کیا ہے وہ ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔''

(ہمارے تبصرے، ص۱۰و ص۱۱)

مبصر موصوف نےحلیمہ فردوس کی نگارشات کا ایک اقتباس بھی سپرد قلم کیا ہے جس سے زبان وادب پر ان کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے:

''شوخ رنگ ہمارے لئے اور بھی وبال جان بن گئے۔ ہمیں دیکھ کر کوئی ملکہ پکھراج کی آواز میں، ابھی تو میں جوان ہوں، کی صدا لگاتا تو کوئی بڈھا گھوڑا لال لگام کا فقرہ کستا، ہار ماننا ہماری سرشت میں نہیں۔البتہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی ہیں۔کوئی طعنے کسے، ناک بھوں چڑھائے، ہماری بلا سے۔'' (ہمارے تبصرے، ص۱۱)

موصوف کا دوسرا تبصرہ ڈاکٹر محبوب راہی کی کتاب ''گل بوٹے'' پر ہے۔

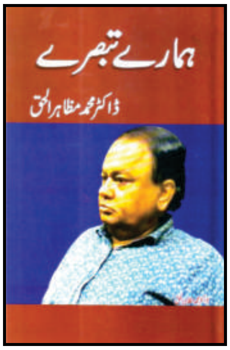

مصنف نے اپنی اس تخلیق کے ذریعے ملت کے نونہالوں کے اذہان و قلوب میں عقیدۂ توحید کی شمع روشن کرنے کی بھرپور امکانی کوشش کی ہے چنانچہ عام روایت سے ہٹ کر انہوں نے توحید، رسالت، ربوبیت اور ایمانیات سے متعلق موضوعات کو اختیار کیا ہے اور ان کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر نہایت احسن اسلوب اور خوبصورت پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ابتدا ہی سے بچوں کے دلوں میں اپنے خالق و رازق اور پروردگار کے بارے میں صحیح عقیدہ جاگزیں ہو جائے، چنانچہ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ:

''یوں تو ہمارے ملک میں اردو زبان کے شاعروں کی کمی نہیں ہے، مگر ایسے شاعروں کی جو بچوں کے لئے نظمیں لکھتے ہوں، ضرور کمی ہے۔ڈاکٹر محبوب راہی نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر محبوب راہی کا مجموعہ کلام ''گل بوٹے'' اسم بامسمیٰ ہے اور اس مجموعہ کی نظموں میں ایک قسم کا تنوع پایا جاتا ہے۔'گل بوٹے' کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔اس نظم میں شاعر نے بچوں کو خدا اور اس کی عظمت سے روشناس کرایا ہے۔اس نظم کے مطالعے سے بچوں کا ذہن اپنے رب کی صناعی، خلاقی، ربوبیت اور اس کے بے انتہا کمال و جمال کا معترف ہوگا۔اس کے بعد نظم 'ہمارے نبیؐ' ہے۔اس نظم میں شاعر نے اپنے پیارے نبی کی سیرت کو دل کش انداز سے موزوں لفظوں کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ایک ایسے زمانے میں جب ہر طرف دین سے بیزاری کا بازار گرم ہے اور ہر طرف لادینیت کا ماحول ہے، ڈاکٹر راہی کی ان نظموں کی اہمیت و معنویت دو چند ہو جاتی ہے۔'' (ہمارے تبصرے، ص۱۲و ص۱۳)

اس نظم کے مطالعے سے بچوں کے دلوں میں عشق رسول کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ ڈاکٹر موصوف کی اس کتاب کو کثیر تعداد میں شائع کیا جانا چاہئے تا کہ اس کا افادہ و استفادہ عام ہو سکے اور بچے ابتدا ہی سے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و عادات اور بلند کردار سے آشنا ہو جائیں اس لئے کہ جو چیزیں بچپن میں دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہیں پھر وہ اخیر وقت تک باقی رہتی ہیں اور وہی چیزیں انسان کی طبیعت بن جاتی ہیں اور عربی کے مشہور مقولہ:

العلم فی الصغر کالنقش علی الحجر
(بچپن کا علم پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتا ہے)
کے مصداق بن جاتی ہیں۔

موصوف نے ڈاکٹر منظر اعجاز کی کتاب ''اقبال: عصری تناظر'' پر بھی اپنا قیمتی تبصرہ پیش کیا ہے جس میں کتاب کی ماہیت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ فلسفہ اقبال کی گہرائی اور گیرائی تک رسائی ہر شخص کے لئے ممکن نہیں، اسی لئے طلبا و اساتذہ اس کی پیچیدگیوں اور گتھیوں کو سلجھانے سے گھبراتے ہیں اور ان سے دور رہنے ہی میں اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں، لیکن منظر اعجاز صاحب ان پیچیدگیوں سے کچھ بھی گھبراتے نہیں بلکہ ان کو حل کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ اقبال کے فکری رجحانات اور میلانات کو سمجھنے اور سمجھانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی اقبال شناسی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کو سمجھنا اور سمجھانا کوئی دشوار گزار عمل نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب میں ''تذکرہ اردو شعرا پلاموں'' پر بھی مبصر موصوف کا تبصرہ موجود ہے جس میں انہوں نے نہ صرف مذکورہ کتاب پر وقیع نظر ڈالی ہے بلکہ تذکرہ کی تاریخ، افادیت اہمیت اور وقعت پر بھی بخوبی اظہار خیال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو ادب کی تاریخ رقم کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تذکروں سے استفادہ کریں، ورنہ ان کی تاریخ مکمل نہیں ہو پائے گی غرض کہ تذکرے تاریخ کی بنیاد ہیں۔'' (ہمارے تبصرے، ص ۳۹)

''تذکرہ اردو شعرائے پلاموں'' میں نوے شعرا کے احوال و کوائف اور ان کی سیرت و سوانح شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جس سے اس خطے کے شعرا و ادبا اور مصنفین و مؤلفین کی علمی و ادبی اور تحقیقی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب سے ریسرچ اسکالروں کو یہاں کے ادبا و شعرا پر تحقیقی مقالات قلمبند کرنے میں سہولت ہوگی۔ موصوف تبصرہ نگار رقمطراز ہیں کہ:

> ''ارشد قمر کی کتاب تذکرہ اردو شعرا پلاموں' میں کئی دُرِ نایاب موجود ہیں ...... یہ کتاب بظاہر پلاموں کے شعرائے کرام سے متعلق ہے جو پلاموں میں پیدا ہوئے سکونت اختیار کی یا کسی نہ کسی شکل میں پلاموں سے ان کا تعلق رہا۔'' (ہمارے تبصرے، ص ۴۰)

اس کتاب میں بعض ہندو شعرا کے تذکرے بھی موجود ہیں جنہوں نے گیسوئے اردو کو سنوارنے اور نکھارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہایت اہمیت و وقعت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جدید نسل کو ہندو شعرا و ادبا جنھوں نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اپنا علمی و قلمی سرمایہ صرف کیا ان کے متعلق اہم اور بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

علاوہ بریں ''بہار میں اردو مرثیہ نگاری کا ارتقا'' جیسی نامی کتاب پر تبصرہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ اس تبصرہ میں موصوف نے نہ صرف کتاب کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ مرثیہ نگاری کی پوری تاریخ ایک مضمون کے اندر سمو دی ہے اور بتایا ہے کہ مرثیہ کا آغاز سرزمین عرب سے ہوا اس کے بعد اس صنف نے ایران کا رخ کیا جہاں اس کے جوبن پر بہار آئی۔ ان ملکوں کا سفر کرتے ہوئے یہ ہندوستان پہنچی جہاں کے قادر الکلام شعرا و ادبا نے اس کو اپنی گود میں لیا اور اس کی اچھی طرح پرورش و پرداخت کی اس کے نوک و پلک کو درست کیا اور اس کو آسمان کی بلندیاں عطا کیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہار میں اردو مرثیہ نگاری کی روایت قدیم رہی ہے اور اس صنف سخن کی آبیاری اور شجر کاری میں یہاں کے بڑے بڑے شعرا کا خون جگر شامل ہے جن میں شادؔ عظیم آبادی، بہارؔ حسین آبادی، احسنؔ رضوی دانا پوری، ہوشؔ عظیم آبادی، دانشؔ عظیم آبادی، کاظم حسین زارؔ عظیم آبادی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب ''ہمارے تبصرے'' ایک نہیں کئی جہتوں سے مفید مطالعہ کتاب کہلانے کی حقدار ہے۔ ❁❁

نام کتاب	:	چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی کہانی
مصنفہ	:	ڈاکٹر بانو سرتاج
ناشر	:	اَرسم پلی کیشنز، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات : ۸۸
قیمت	:	۱۱۰ روپے
مبصر	:	**محمد غفران**

ڈاکٹر بانو سرتاج اردو میں ادب اطفال کے فن کاروں کی فہرست کا ایک بڑا اور خوب جانا پہچانا نام ہے۔ انہوں نے اگر چہ بڑوں کے لئے بھی معیاری ادب پیش کیا ہے، لیکن درحقیقت ان کی پہلی شناخت بچوں کی ادیبہ کے طور پر ہے۔ وہ پچھلے بیس برسوں کے دوران نونہالوں کے لئے ۹۸ کتابیں لکھ چکی ہیں اور وہ سبھی اشاعت یافتہ ہیں اور اس اعداد وشمار ہی سے ان کی مقبولیت اور فعالیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

بانو سرتاج نے بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں صرف تفریح کا سامان ہی نہیں ہے بلکہ وہ کتابیں بجائے خود طرح طرح کی معلومات کا بیش بہا خزانہ کہلانے کی حقدار ہیں اور اس کا تازہ ثبوت اُن کی ''چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی کہانی'' ہے جو اس وقت میرے سامنے کھلی رکھی ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج کی یہ کتاب دراصل چھ دلچسپ معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے اور یقیناً ایک ایسا خوبصورت مجموعہ جو بچوں کے لئے نہیں، بلکہ بڑوں کے لئے بھی ان کی معلومات میں اضافہ کا باعث بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس مجموعہ کا انتساب بانو سرتاج نے نہایت برجستہ انداز میں ان بچوں کے نام کیا ہے ''جو بچپن کے اسکول میں پڑھ سکے نہ سب سے بڑے ٹیچر Curiosity سے فیض یاب ہو سکے'' یہ انتساب یقیناً مصنفہ کے اس جذبے کا غماز ہے۔

اس کتاب میں ''اپنی بات'' کے تحت بانو سرتاج نے لکھا ہے کہ وہ بچوں کے لئے ''چند دلچسپ کردار'' لے کر آئی ہیں: ''یہ مضامین لڑکے لڑکیوں سب بچوں کے لئے ہیں۔'' جن سے ملوانے کے لئے (واقعی انہیں) بہت محنت کرنی پڑی ہے۔ مزید انہیں کے لفظوں میں یہاں:

''موگلی عجیب وغریب دلچسپ کردار ہے تو سانتا کلاز بچوں کا چہیتا کردار ہے۔ مختلف اقسام کی گڑیائیں اور کٹھ پتلیاں انسان کے ہاتھوں کا کمال ہے تو روبوٹ شاہکار ہیں، انسان کی ترقی کی معراج ہیں انسان کی دنیا میں خوشگوار اضافہ ہیں۔''

بچوں کے لئے مصنفہ کی ''اپنی بات'' کا یہ آخری حصہ، یہ پیغام بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ:

''بچو! ان سب کے بارے میں پڑھو، انہیں جانو، پتنگ کی مانند اوپر اُٹھ کر زندگی کو مطالعہ سے نکھارو، زندگی میں اتارو تو زندگی کا صحیح لطف اٹھا سکو گے۔''

کوئی بھی تصنیف خواہ کسی موضوع پر ہو اور بڑوں کے لئے ہو یا چھوٹوں کے لئے بہر حال اس کا ایک بنیادی مقصد ہوتا ہے اور مذکورہ سطروں سے بہر صورت یہاں بانو سرتاج کا مقصد تصنیف بالکل واضح ہو جاتا ہے اور یہ نکتہ بھی کہ اس کتاب کے مضامین دراصل بچوں کی دلچسپی کے ''کرداروں'' پر لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ کردار کا اصطلاحی مفہوم بہت وسیع ہے۔ مثلاً کردار وہ بھی ہوتے ہیں جو جان رکھتے ہیں اور کردار وہ بھی ہو سکتے ہیں جو اگر چہ جاندار نہ ہوں، مگر اپنے اثر کی بدولت اپنی ایک تاریخ رکھتے ہوں اور اس کتاب کے مضامین کی سرخیاں جن کرداروں سے سجی ہیں وہ ایسے ہی کردار ہیں۔

بانو سرتاج کی زیر نظر کتاب کے مضامین کا آغاز ''چلی چلی رے پتنگ'' سے ہوتا ہے۔ صفحہ ۹ سے صفحہ ۲۲ تک پھیلے ہوئے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ پتنگ عموماً ہوا سے بھاری ہوتی ہے اور ہوا سے ہلکی پتنگ 'ہیلی کانٹ'' کہلاتی ہے۔ پتنگ بازی ایک عمدہ تفریح ہی نہیں، معاشرتی تعلقات میں مددگار اور Healthy کمپٹیشن کے فروغ کا باعث بھی ہے۔ پتنگ کی تاریخ کم از کم دو ہزار سال پرانی ہے۔ پہلی پتنگ ۱۹۵ قبل مسیح چین میں بنائی گئی تھی۔

پتنگ کے فوائد اور اس کی تاریخ بتاتے ہوئے بانو سرتاج نے اس مضمون میں پتنگ سے جڑے عقیدوں، مختلف ملکوں میں پتنگ کے مختلف نام، پتنگ اڑانے کے موسم، پتنگ بازی سے جڑے دلچسپ تاریخی واقعات اور سائنسی ایجادات میں پتنگ کے رول کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ پتنگ بازی کو بین الاقوامی کھیل بتاتے ہوئے، باکس، ڈیلٹا، سلیڈ

اور ڈائمنڈ وغیرہ پتنگ کے مختلف اقسام کی بھی معلوماتی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ سب سے بڑی پتنگ جاپان میں ۱۹۱۶ء میں بنائی گئی اور پتنگ بازی میں ۱۵ اسنٹی میٹر کی سب سے نیچی اڑان کا ریکارڈ بھارت کے سیندر بہادر کے نام رہا، اسی کے ساتھ ساتھ پتنگ بازی سے ملنے والے اخلاقی سبق کی بھی مصنفہ نے ان الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ اگر چہ:

''پتنگ بظاہر تفریح کا ذریعہ ہے، لیکن ہم چاہیں تو اس سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ ذرا سنو تو سہی، کیا کہتی ہے پتنگ؟ اوپر اُٹھو، آسمان چھونے کی کوشش کرو، لیکن اپنے پاؤں زمین سے نہ اُٹھنے دو۔ ڈسپلن اور تہذیب کی ڈور سے بندھے رہو تا کہ راستے سے نہ بھٹکو۔ ڈور جتنی مضبوط ہوگی، پتنگ کا اوپر جانا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ اپنے مقصد پر نظر رکھو، ارادے کو پکا رکھو تو مستقبل تابناک ہوگا، جو پتنگ کاٹتا ہے اس کی پتنگ بھی کٹتی ہے یعنی ہار جیت دونوں کے لئے تیار رہو۔'' (چھوٹی سی گڑیا، ص ۲۱)

زیر نظر کتاب کا دوسرا مضمون ''چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی کہانی'' اصل میں ٹائٹل مضمون ہے۔ صفحہ ۲۳ سے صفحہ ۳۲ تک پھیلے ہوئے اس مضمون میں مصنفہ نے یہ بتاتے ہوئے کہ ایک دور تھا جب ہر عورت کو گڑیا بنانا آتا تھا، بڑے کرب سے لکھا ہے کہ:

''آج بچیاں ہیں، بچپن ہے، لیکن گڑیا کہیں غائب ہوگئی ہے۔'' (چھوٹی سی گڑیا......ص ۲۴)

اور پھر دنیا کی مختلف زبانوں اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں لفظ ''گڑیا'' کا مترادف بتاتے ہوئے اور مختلف علاقوں کی گڑیوں کی ساخت کا ذکر کرتے ہوئے بہار کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''بہار کی مٹی کی گڑیا اکثر رقص کے مختلف پوز میں ہوتی ہے اور شادی میں دی جاتی ہے۔'' (چھوٹی سی گڑیا، ص ۲۵)

اتنا ہی نہیں بلکہ اس مضمون میں گڑیوں کے تہوار، بعض تہواروں میں گڑیوں کی خاص اہمیت، گڑیوں کے تعلق سے ملک اور بیرون ملک کے مختلف رسم و رواج کا تذکرہ بھی آیا ہے اور اس زمانے کی ''ڈربی گڑیا'' کا خصوصی تعارف کراتے ہوئے مصنفہ نے آخر میں لکھا ہے کہ:

''گڑیا بنانے کے فن پر زیادہ توجہ نہ دے کر ہم بھارتیہ اپنے ایک قابل قدر فن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔''

(چھوٹی سی گڑیا، ص ۳۲)

اس کتاب کا صفحہ ۳۳ سے صفحہ ۴۶ تک پھیلا ہوا تیسرا مضمون ''خوشیوں کا سفیر: سانتا کلاز'' ہے، جس میں مصنفہ نے ''کرسمس تہوار کے ہیرو'' اور ''بچوں کے پیارے'' سانتا کروز کی نہ صرف تاریخ بتائی ہے بلکہ مختلف ملکوں میں اس کے مختلف ناموں کی باقاعدہ فہرست بھی دی ہے اور اس تعلق سے منائے جانے والے تہوار اور رسم و رواج کے تذکرے ہی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ اس موضوع پر ایک ایک اردو اور ہندی نظم بھی اپنے مضمون میں شامل کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

''سانتا کروز خوشیوں کا وہ سفیر ہے جس کے ذریعہ والدین بچوں کو اچھائی اور سچائی کا پیغام دیتے ہیں۔''

(چھوٹی سی گریا، ص ۴۴)

زیر نظر کتاب کا چوتھا مضمون ''روبوٹ کی کہانی'' ہے۔ صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۶۴ تک پھیلے ہوئے اس مضمون میں مصنفہ نے لکھا ہے کہ لفظ ''روبوٹ'' چیک زبان سے آیا ہے جس کے لغوی معنی ''بندھوا مزدور'' کے ہیں اور پھر یہ بتاتے ہوئے کہ پہلا روبوٹ ۱۹۲۸ء میں بنا تھا، اس کی تاریخ کے مختلف ترقیاتی ادوار کو سامنے لایا ہے اور طرح طرح کے روبوٹ کے حیرت انگیز کارناموں کا ذکر کیا ہے اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں معلوماتی مواد کے ساتھ ساتھ دو باتیں اور بھی تحریر میں لائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ روبوٹ کی ہزار اہمیت سہی، لیکن ۱۹۹۳ء میں سائنسی ناول نگار ورنوٹ ونگ نے روبوٹ کو ''انسانی دور کے خاتمہ کا جو قریبی پیش خیمہ'' کہا تھا اور جو عقیدہ ظاہر کیا تھا، اس سے یہ لکھ کر مصنفہ نے اظہار برأت کر لیا ہے کہ ''دیکھتے ہیں غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟'' (چھوٹی سی گڑیا، ص ۶۴) اور دوسری بات یہ کہ روبوٹ کے فوائد بتانے سے پہلے

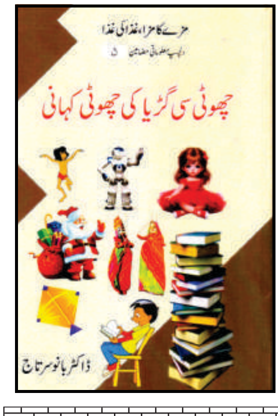

مصنفہ نے یہ ہوشیار کردینے والا قول بھی نقل کردیا ہے کہ:

''مشینیں اچھی غلام ہوتی ہیں، مگر اچھی مالک ثابت نہیں ہوتیں، خراب مالک ثابت ہوتی ہیں۔'' (چھوٹی سی گڑیا ص ۴۷)

بانو سرتاج کی اس کتاب کا چوتھا دلچسپ مضمون ''بول ری کٹھ پتلی'' صفحہ ۶۵ سے شروع ہوکر صفحہ ۷۵ تک پہنچتا ہے، جس میں نہ صرف کٹھ پتلی کا انگریزی نام "Puppet" اور دوسرا ہندی نام ''پتل'' بتاتے ہوئے اور اس کی قدیم تاریخ اور دھاگا، دستانہ، جل اور کاغذ وغیرہ کٹھ پتلی کی مختلف اقسام کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے یونان قدیم، مصر اور ترکی کی کٹھ پتلیوں کے بارے میں معلومات دی گئی ہے بلکہ کٹھ پتلی کے کھیل تماشے کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے مصنفہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''کٹھ پتلیوں کے کھیل معاشرتی برائیوں کی بیخ کنی اور عوام کو ان کے فرائض کی ادائیگی کے لئے بیدار کرنے کے مقاصد پر مبنی ہوتے ہیں...... حالیہ دور میں نکڑ ناٹک جس طرح سماجی بیداری کا کام کرتے ہیں اسی طرح کٹھ پتلی کے کھیل دیہی علاقوں میں یہ ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ حفظان صحت، ماحولیات کا تحفظ، خواندگی، لڑکیوں کی تعلیم وغیرہ سماجی مسائل ایسی ہی کوششوں سے حل ہوسکتے ہیں۔ مشہور تاریخی ہستیوں، مہابھارت، رامائن، سنہاسن بتیسی وغیرہ کے واقعات بھی کٹھ پتلی کے کھیل کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں...... کٹھ پتلیاں سماجی برائیوں کو دور کرنے اور تہذیب اور اقدار کی جڑیں مضبوط کرنے میں مدد تو کرتی ہی ہیں، وہ کلاس روم انسٹرکشن میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ چند مضامین خصوصاً تواریخ میں Dramatization کے ذریعہ بچوں کو آسانی سے اہم واقعات اور مشکل نکات ذہن نشین کرائے جاسکتے ہیں۔''

(چھوٹی سی گڑیا، ص ۷۱ و ص ۷۵)

یہ اقتباس ذرا طویل ضرور ہے، مگر اس تبصرے میں اسے نقل کردینے کا خیال اس لئے بھی بار بار آیا کہ اس سے بانو سرتاج کی اس کتاب کا ایک اور رُخ یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ انہوں نے کتنے وسیع تناظر میں اور کتنے گہرے تجرباتی نتائج کی روشنی میں بر سبیل تذکرہ تدریسی افادیت و سہولت کے نکات بھی تحریر کردیے ہیں۔

اس کتاب کا چھٹا اور آخری مضمون ''موگلی'' (Mogly) ہے جو صفحہ ۷۶ سے کتاب کے آخری صفحہ ۸۲ تک دراز ہے یا یوں کہیں کہ بانو سرتاج کی تصنیفات کی فہرست کے عنوان سے پہلے تک اپنا پھیلاؤ رکھتا ہے اور یہ کہنے میں ذرا بھی مبالغہ کا احساس نہیں ہوتا کہ موضوع و مواد دونوں ہی لحاظ سے یہ بہت ہی نادر مضمون ہے۔ یہ مضمون جنگلی لڑکی، جنگلی لڑکا، لوبو بھیڑیا لڑکی، تیندوا لڑکا، بھیڑیا لڑکا، بندر لڑکا، بندر لڑکی، بھیڑیا بہنیں، مرغ لڑکا، پرندہ لڑکا اور کتا لڑکی جیسے ذیلی عنوان کے ساتھ سامنے آتا ہے اور بہرصورت حیرت انگیز مشاہدے کی ایک دنیا ساتھ لاتا ہے۔ یہاں جیسا کہ مصنفہ نے لکھا ہے ایک طرف تو ''موگلی'' وہ کردار ہے جو جان لاک ڈڈ کے ذہن کی اختراع ہے اور دوسری طرف موگلی کے اس خیالی کردار کے علاوہ موگلی بچوں کے حقیقی کردار بھی ہیں جن کے بارے میں ذیلی سرخیوں کے ساتھ معلومات یکجا کی گئی ہیں۔

اصل میں وہ لڑکے یا لڑکیاں یا یوں کہا جائے کہ آدمی کے وہ بچے جن کی پرورش جنگل میں کسی جنگلی جانور نے کی ہو ''موگلی'' بچے کہلاتے ہیں۔ انسان کی فطرت پر تربیت اور ماحول کا اثر لازمی ہے اور اس کا ثبوت نفسیاتی طور پر موگلی بچوں کے وجود اور ان کی حرکات وسکنات سے بخوبی مہیا ہوجاتا ہے مثلاً میکسیکو میں بھیڑیا لڑکی مردہ بکری کا کچا گوشت کھاتی ہے۔ پانچ سال کا تیندوا لڑکا تیندوے کی ہی طرح گوشت خور اور خونخوار بن جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ بانو سرتاج کی یہ کتاب مجموعی لحاظ سے اپنے موضوع و مواد پر بہت ہی کامیاب ہے۔ شوقین طلبا و طالبات چاہیں تو اس سے معلومات عامہ کے سوالوں کا ایک نہیں کئی سیٹ بنا سکتے ہیں اور مترادفات کی ایک چھوٹی سی ڈکشنری بھی۔

امید قوی ہے کہ بانو سرتاج کی یہ کتاب ''چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی کہانی'' جب ہاتھ میں آئے گی تو ورق ورق پڑھ لئے جانے کے بعد ہی کتابوں کے شلف میں واپس جائے گی اور گارجین حضرات اس کتاب تک بچوں کی رسائی ضرور آسان بنائیں گے۔ ❀❀

☆ ''زبان وادب'' جون ۲۰۲۵ء ملا۔شکریہ! حسب معمول یہ شمارہ بھی خوب سے خوب تر بنا کر پیش کرنے کی کوششوں سے عبارت ہے۔ ''حرفِ آغاز'' میں، شمارہ میں شامل مقالات اور افسانے کا مختصر، مگر خوبصورت انداز میں تعارف پیش کیا گیا ہے۔تعارف کے اس انداز سے کالم''منظومات''، ''کتابوں کی دنیا'' اور''بچوں کا زبان و ادب'' کو بھی نوازا کریں۔ غالبًا جگہ کی کمی ایسا نہ کرنے دیتی ہوگی۔ پروفیسر رئیس انور کا مقالہ''پروفیسر اعزاز افضل:شخصیت اور نگارشات'' پروفیسر موصوف کی حیات و خدمات سے متعلق کئی اہم پہلوؤں کا احاطہ عمدہ انداز میں کرتا ہے۔مقالہ میں پروفیسر محترم کے مطالعات و مشاہدات کی جلوہ گری متوجہ کرتی ہے۔انہوں نے بجا طور پر اعزاز افضل کی شاعری کے سارے Shades کو سامنے لانے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔اس مضمون میں ایک جگہ (ص ۱۰پر) شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا ایک شعر یوں پیش کیا گیا ہے ۔

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو بس یہی دو پشت ، چار پشت

یہ شعر اس طور پر عرصہ سے کئی جگہ بولتے لکھتے دیکھ رہا ہوں۔اس چلن کے سبب کہیں یہ شعر اسی طور پر درست نہ سمجھا جانے لگے، اس لئے یہاں کچھ باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے کئی دیوانِ ذوقؔ (اور ایک کلیات) دیکھے، مگر پہلے مصرعہ میں ''قلم'' بجائے''سخن'' اور مصرعہ ثانی کی یہ صورت نہیں ملی۔ ذوقؔ نے اپنے کئی شعر پر نظر ثانی کی، جزوی ترمیم کی، لہٰذا چند شعر کی دو صورتیں مختلف دیوان میں ملتی ہیں، لیکن متذکرہ مصرعہ ثانی اور''سخن'' کی جگہ ''قلم'' کی صورت نہیں ملتی۔اس شعر کی جو دو صورتیں ناچیز کے مطالعے میں آئیں، وہ یہ ہیں ۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اورلاد سے تو ہے یہی دو پشت ، چار پشت

شعر کی یہ صورت ''دیوانِ ذوقؔ'' کے درج ذیل ایڈیشن میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:(۱) دیوانِ ذوقؔ ،مرتبہ خواجہ قمرالدین احمد، نامی پریس لکھنؤ، اپریل ۱۹۲۷ء ،ص ۴۳، (۲) مشورہ بک ڈپو، دہلی، اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۵۵، (۳) منیرؔ لکھنوی، مطبع مجیدی کانپور، ص ۴۱ (۴) مرتبہ طالب علی، رام نرائن لعل الہ آباد، ۱۹۲۹ء، ص ۳۰، (۵) مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۰۷ء، مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد، گرگ اینڈ کمپنی، دہلی (۶) شیخ غلام علی برکت علی تاجران کتب کشمیری لاہور، ص ۲۲ (۷) مرتبہ ابوالحسنات قطب الدین احمد، بار پنجم ماہ اگست ۱۹۰۶ء، ص ۳۳، بار ہفتم ماہ ستمبر ۲۰۱۳ء (۸) ۱۹۲۶ء میں شائع انتخاب غزلیات ذوقؔ (آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان) میں یہ شعر اسی طرح درج ہے ۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے رہے یہی دو پشت ، چار پشت

شعر کی یہ صورت ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب کلیاتِ ذوقؔ (۱۹۶۷ء) میں صفحہ ۲۱۳ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی اسی کتاب سے مخمور سعیدی نے''مونوگراف شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ'' (اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۸ء) میں ذوقؔ کا منتخب کلام پیش کیا ہے، جس میں یہ شعر شامل ہے۔اس ضمن میں مخمور سعیدی لکھتے ہیں:''آئندہ صفحات میں ذوقؔ کا جو منتخب کلام پیش کیا جارہا ہے، وہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی مرتبہ کلیات ذوقؔ (اردو) سے لیا گیا ہے جو کلام ذوقؔ کا اب تک کا سب سے جامع اور مستند متن ہے۔'' (ص ۶۱) ''زبان وادب'' کے اسی شمارہ میں آپ نے میری غزل شائع کی ہے، بہت بہت شکریہ! میں نے اس غزل کے چوتھے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں جزوی ترمیم کی

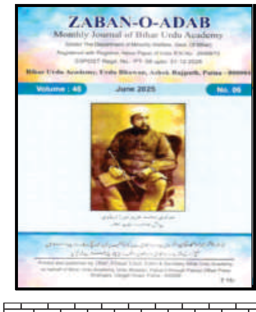

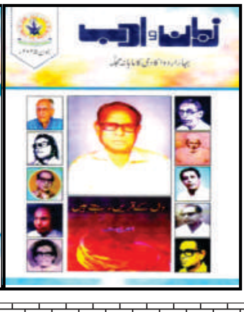

ہے۔ یہ شعر یوں پڑھا جائے ۔

بہر سو گویا سخن کی راہیں ، بہر سو پھیلی خموش گاہیں
جو دیکھو تو یہ فلک ہے محنت، جو سوچو تو یہ زمیں ہے فرصت

اس غزل کا مقطع مجھ سے ہی سہواً درج ہونے سے رہ گیا تھا، اسے بھی گوارا کرلیں ۔

عطاؔ یہ فکرِ سخن تمہاری کہیں نہ ہو اب جنوں سے عاری
یہ کیسی مصروفیت ہے جس میں خرد کے زیرِ نگیں ہے فرصت

(ڈاکٹر) عطا عابدی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' جون ۲۰۲۵ء ملا۔ اب ڈیڑھ دو سال ہونے کو آرہے ہیں اور مسلسل یہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ مجلّہ کے سرورق پر آپ کی بہت ہی خاص توجہ اور محنت سے، اس کی معنویت کے نت نئے رنگ کھلتے جارہے ہیں۔ اب یہی دیکھئے تا کہ ماہِ اشاعت کا خیال رکھتے ہوئے آپ نے ایک فن کار کے خاکوں کا مجموعہ لیا ہے اور جو مشہور افسانہ نگار احمد یوسف کے ''دل کے قریں رہتے ہیں'' ان کے چہروں سے مصنف اور تصنیف کے چہرے سمیت سرورق کو سجا دیا ہے یا پھر اس طرح کہنے کی اجازت دیجئے کہ ڈاکٹر محمد قیام الدین نیر کے مقالے کو جو صفحہ ۱۴ سے صفحہ ۱۷ تک پھیلا ہوا ہے، گویا رنگین و باتصویر بنا کر اس میں نئی جان لا دیا ہے، پھر پس ورق پر مولوی محمد عزیز مرزا دہلوی کی تصویر نے بھی اسے دستاویزی بنا دیا ہے۔ پہلا اندرونی سرورق، تحریری اقتباس، سوانحی کوائف اور رنگین تصویر کے ساتھ معروف افسانہ نگار اور صحافی شبیر احمد کی یادیں تازہ کررہا ہے تو دوسرا اندرونی سرورق، ناول اور افسانے سے لئے گئے دو اقتباس، مختصر سوانح حیات اور رنگین تصویر کے ساتھ ناول نگار وصحافی آچار یہ شوکت خلیل سے ملاقات کا موقع دے رہا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ اہل قلم تھے کہ نہ تو بہار کی اردو صحافت انہیں بھلا سکتی ہے، نہ ہی بہار کا افسانوی ادب۔ زیر نظر شمارے کے ''مقالات'' میں پروفیسر رئیس انور کا وہ مقالہ واقعی بہت کامیاب ہے، جس میں انہوں نے اپنے استاد پروفیسر اعزاز افضل کی شخصیت اور ان کی نگارشات پر جامع طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر اعزاز افضل، شعرائے بنگالہ کی فہرست کا ایک بڑا نام ہے۔ ''معاصرین کلکتہ'' کے مصنف جناب نورالہدیٰ نے انہیں ''صاحب طرز غزل گو'' لکھا ہے تو اس میں مبالغہ نہیں اور زیر نظر مضمون میں پروفیسر اعزاز افضل کی شاعری کے تعلق سے ترقی پسندی پر مستزاد عشق وعرفان کی جو بات کہی گئی ہے، اسے بھی بے اساس قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پروفیسر اعزاز افضل ایک بڑے شہر میں زندگی گزار رہے تھے اور انہیں بیشک یہ کہنے کا حق تھا کہ ۔

مجھ سے پنہاں نہیں شہروں کی حقیقت افضلؔ
لوگ ویرانوں میں رہتے ہیں در و بام کے ساتھ

اشعار میں معنی کی تہداری تو ہوتی ہی ہے، یہاں ''شہروں کی حقیقت'' کو آپ ''شہر دل'' سے منسوب کرلیں تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کا سرا عشق وعرفان سے بھی مل جائے گا، مگر حقیقت تو یہی ہے کہ یہاں شاعر کے سامنے اپنے اردگرد کا وہ معاشرہ اور اپنے عہد کی وہ صبح وشام ہی ہے جہاں شہروں کی زندگی محض نمائشی بن کر رہ گئی ہے۔ بہرصورت بات کسی اور طرف جانے لگی آمدم برسر موضوع! ''زبان وادب'' کے مقالاتی حصہ میں، مذکورہ مضمون کے ساتھ ساتھ جناب محمد ولی اللہ قادری کا مضمون بھی خاص توجہ اور شوق کے ساتھ پڑھا، جہاں تک میرا خیال ہے، تحقیق وتنقید کا ایک اہم اور خاص وظیفہ یہ بھی ہے کہ شعروادب کی بھولی بسری گمنام شخصیتوں کو ڈھونڈا جائے اور انہیں سامنے لایا جائے ۔ اس رُخ سے چمپارن کے گمنام شاعر و ادیب عنایت الرحمٰن عنایتؔ پر لکھنے کے لئے جناب قادری یقیناً شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس مضمون سے کئی بالکل نئی سوانحی باتوں کا علم بھی ہوا۔ ''اردو املا: ایک بازدید'' کے عنوان پر جناب زبیر احمد بھاگلپوری کی باتیں بھی یقیناً کئی پہلو سے لائق اعتنا کہلائیں گی۔ بیشک درست املا نویسی پر توجہ اور اس کی تربیت بہت ضروری ہے۔ ''حرف آغاز'' میں آپ نے اس شمارے کی مشمولہ کہانیوں پر جو کچھ لکھا ہے، وہ یقیناً بالکل برجستہ باتیں ہیں۔ فاضل شفیع بٹ کا ''بنجر پور کا قبرستان'' ہو یا ڈاکٹر نسرین بانو کی ''قمرن بوا'' منافقت میں ڈوبے کردار تو ہر جگہ موجود ہیں۔ اس شمارے میں عزیز مرزا (مرحوم) کی سوانح کے ساتھ ''گرمی کا سماں'' بھی ایک دستاویزی تحفہ ہی کہلائے گا۔ آپ نے ٹھیک لکھا

ہے کہ اس میں ایک اسلوب بھی ہے اور ایک فکر بھی اور مجھے کہنے دیں کہ اسے پڑھتے ہوئے مجھے جس چیز نے بار بار متاثر کیا، وہ تشبیہوں کا استعمال ہے۔ ذرا یہ سطریں تو دیکھئے ''بیقرار بجلی ہر طرف مندروں کی طلائی قندیلوں کی طرح پرنور شعاعیں پھیلا رہی ہے اور ڈرپوک چاندنی غریب کی جورو کی طرح بادلوں کے پیچھے سے ڈرتی کانپتی جھانک رہی ہے۔'' شعری حصہ بھی حسب روایت جاندار و شاندار ہے اور کتابوں پر تبصرے بھی وقیع اور کامیاب ہیں۔

عبدالرزاق پیکرؔ رضوی، پٹنہ

☆ ماہ جون ۲۰۲۵ء کا ''زبان وادب'' ملا۔ اس شمارے میں بھی روایت کے مطابق بچوں کے لئے بہت اچھی اچھی چیزیں پیش کی گئی ہیں اور اُن کے لئے جو آٹھ صفحے خاص ہیں ان کا بہترین مصرف لیا گیا ہے۔ نظم ''خدا کی پناہ'' سے ''بچوں کا زبان وادب'' شروع ہوتا ہے اور اخلاقی مضمون ''خیرات اور دان'' تک پہنچتا ہے۔ حافظ تمناؔ پھلواروی نے مذکورہ نظم میں جو باتیں لکھی ہیں وہ اٹل سچائیاں ہیں۔ اللہ ہی اپنے بندوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے اور اس کا سچا بندہ وہی ہے جو اپنے رب سے راضی رہتا ہے اور اس کا شکر بجالاتا ہے۔ بیشک انسان چھپ چھپ کر دنیا میں کتنے ہی گناہ کر لے، مگر آخرت میں اس کی پکڑ ہونی ہی ہے اس لئے انسان کو ہمیشہ شیطان کے بہکاوے سے اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر کی نظم ''نیک راستہ'' بھی بہت پسند آئی۔ یہ نظم شاہد نامی ایک لڑکے کی کہانی ہے جو باغ سے امرود چراتے ہوئے پکڑا گیا اور اس کو چوری کی سزا ملی۔ اس میں نصیحت یہی ہے کہ برے کام کا انجام برا ہوتا ہے اس لئے ہمیشہ بری عادتوں سے بچنا اور نیک راستے پر چلنا چاہئے۔ آدمی کہانی سے فطری دلچسپی رکھتا ہے، اسی لئے نصیحت کہانی کی شکل میں ہو تو زیادہ اثر کرتی ہے اور یہاں شاعر نے اس بات کا بنیادی خیال رکھا ہے جو کامیابی کی دلیل ہے۔ اس بار بچوں کے حصہ میں صباؔ نقوی کی نظم ''صابر کے ہمراہ خدا ہے'' بھی پڑھنے کو ملی۔ قرآن شریف میں اس مضمون کی آیت مشہور و معروف ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' صبر وتحمل یقیناً ایک عظیم صفت ہے بیشک ؎

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
صبر سے سر اونچا ہوتا ہے

صبر سے دعا میں تاثیر ملتی ہے، درد میں آرام آتا ہے ؎

صبر جہاں میں رَدّ بلا ہے
صابر کے ہمراہ خدا ہے

اور پھر شاعر کی یہ نصیحت تو ہمیشہ کے لئے یاد رکھنے کی چیز ہے کہ ؎

وقت مصیبت پیارے بچو
صبر کا دامن ہاتھ میں رکھو

صبر ورضا کی فضیلت پر لکھی گئی اس نظم کی سادہ اور ہلکی پھلکی، صاف ستھری زبان بھی دلوں کو موہ لینے والی زبان ہے۔ اس شمارے میں صداقت علی کی کہانی ''گوبر کی ٹوکری'' بھی بہت پیاری اور بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ اس میں ایک طرف تو استاد کا کردار ہے کہ وہ کس طرح اپنے شاگردوں کو کامیابی کا راستہ دکھاتا ہے، انہیں ہمت دلاتا ہے اور ان کی غریبی کے دنوں میں پڑھنے کے لئے اُن کی مالی مدد کرتا ہے اور دوسری طرف اسلم نامی اُس لڑکے کا کردار ہے جو کبھی گاؤں میں غربت کا مارا ''گوبر کی ٹوکری'' سر پر اٹھائے پھرتا تھا، لیکن جب اسے راستہ دکھایا گیا تو پڑھ لکھ کر وہ ایک کامیاب ڈاکٹر ہی نہیں بن گیا بلکہ اس نے گاؤں میں غریبوں کے مفت علاج کا کلینک بھی کھول لیا۔ بیشک اس کہانی میں بچوں کے لئے بھی اور بڑوں کے لئے بھی اپنے آپ کو اور اپنے سماج کو بہتر بنانے کا کئی پیغام ملتا ہے جو مقصد کے لحاظ سے کہانی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ جہانگیر اُنس کے قلم سے ''گرگٹ کی باتیں'' بھی خاصی معلوماتی ہیں۔ یہاں اصل مضمون کو ایک کہانی کی فضا میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں اردو محاورہ کے مطلب کی جانکاری بھی ہے اور گرگٹ کے تعلق سے سائنسی معلومات بھی۔ گرگٹ کو موذی جانور کہہ کر اس سے جڑی قدیم روایتی باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں اور اس کے بارے میں

مختلف قسم کے مذہبی خیالات اور عقیدے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں، مگر یہاں جو سائنسی تحقیق بتائی گئی ہے، وہ بہت نادر ہے پھر یہ بھی کہ ممکن تھا، دادی جان روایتی پرانی باتیں ہی چھیڑ دیتیں، لہٰذا ان سے بچنے بچانے کے لئے جس خوبصورتی سے کہانی کا رخ موڑ لیا گیا ہے، وہ بھی قابل تعریف ہے۔ اس شمارے میں مجھے بہت خاص طور سے جو کہانی پسند آئی، وہ ہے: ''......جب دریائی گھوڑا دھاڑا'' چڑیا گھر کی سیر سے جڑی یہ کہانی عائشہ رفعت نے لکھی ہے اور یقیناً اس کہانی میں دلچسپی ہی دلچسپی ہے، مگر میں نے شاید غلط لکھ دیا، اس لئے کہ کہانی میں خالو جان کے ذریعہ دریائی گھوڑے کے بارے میں بہت ساری طرح طرح کی معلومات بھی تو مہیا کر دی گئی ہیں۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر عائشہ رفعت کو مبارکباد! کہ انہوں نے اتفاق سے دریائی گھوڑے کو دھاڑتے ہوئے دیکھا، تو ہمیں بھی اس کا پورا پورا حال دکھا دیا۔ میں نے اس خط کے شروع میں مضمون ''خیرات اور دان'' کا ذکر کیا تھا۔ رضوان احمد کا یہ مضمون، اپنے موضوع پر واقعی بہت اچھا ہے۔ خاص طور سے اس مضمون کا آخری پیراگراف تو باتوں ہی باتوں میں ایک بالکل نئی معلوماتی بات دے گیا کہ دکھنی بھارت کو ''دکن'' یا ''دکھن'' کا نام بھارت میں آنے والے آریا لوگوں نے دیا تھا اور اس لحاظ سے دیا تھا کہ سفر کے دوران وہ علاقہ دکشنا دینے والے ہاتھ یعنی ان کے داہنے ہاتھ کی طرف پڑ رہا تھا۔ زیادہ اب پھر نئے شمارے کے انتظار کے ساتھ خدا حافظ!

یاسمین پروین، مدھوبنی

☆ ''زبان وادب''، مئی اور جون ۲۰۲۵ء کا شمارہ چند ہی دنوں کے آگے پیچھے ملا۔ ماہ مئی کے رسالے میں بچوں کے حصے کی جان تو بس محترمہ ذکیہ مشہدی کی کہانی ''امرود والی اماں'' ہے۔ ''املا اور امالہ'' پر ثنا ثمرین صاحبہ کا مضمون بھی بہت معیاری ہے۔ اب آئیں، جون کے شمارے کی طرف! اس میں ''بچوں کا زبان وادب''، محترم صداقت علی کی کہانی ''گوبر کی ٹوکری'' اور محترمہ عائشہ رفعت کی کہانی ''......جب دریائی گھوڑا دھاڑا'' کی بدولت بہت دلچسپ اور بہت خاص ہو گیا ہے۔

سروری بانو، بھوجپور، آرہ

☆ ماہنامہ مجلّہ ''زبان وادب''، مئی ۲۰۲۵ء دستیاب ہوا، شکریہ! بیشک اس ماہ کے شمارے کو بھی آپ نے سابقہ شماروں کی طرح خوب سے خوب تر، جاذب نظر اور معیاری بنانے کی ہر ممکن سعی کی ہے، جس کا اگر اعتراف نہ کیا جائے تو یہ بہرحال ایک قسم کی بددیانتی ہوگی۔ سرورق اور پس ورق کی زیبائش اور ان کا مناسب مصرف کوئی آپ سے سیکھے۔ ''حرف آغاز'' کے تحت شمارے کے مشمولات کا اختصار سے پیش کیا گیا تعارف نہایت ہی دلکش ہے، جو ایک ایک تخلیقات کے مطالعے کا ذوق وشوق دوبالا کر دیتا ہے۔ ''مقالات'' کے حصے میں اس بار خاصا موضوعی تنوع واضح طور پہ دکھائی دے رہا ہے۔ ڈاکٹر سید اشہد کریم کا مقالہ ''پرویزؔ شاہدی کی غزل گوئی'' نہایت ہی دلچسپ، پرمغز اور تحقیقی نوعیت کا حامل اور طوالت کے باوجود حاصل شمارہ ہے اور پروین اشرفی، ڈاکٹر محمد مجاہد حسین اور ممتحنہ اختر کے مقالے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ پیش نظر شمارے میں دو افسانے شامل اشاعت ہیں اور دونوں ہی افسانے قاری کے ذہن کو کافی دور تک سفر طے کراتے ہیں۔ اگر منظومات کے حصے کی بات کی جائے تو افسر جمال افسرؔ کی نعت پاک، سلطان احمد ساحلؔ کی نظم ''بے سمت رفتار زندگی'' اور مناظر حسن شاہینؔ کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے کالم میں خالد عبادی اور ڈاکٹر رفیق احمد کے تبصرے یقیناً بے لاگ اور معلومات بخش ہیں۔ ''بچوں کا زبان ادب'' میں شامل تخلیقات بھی یقیناً بچوں کے لئے مفید اور سبق آموز ثابت ہوں گی۔

(ڈاکٹر) قیصر زاہدی، پٹنہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا
زبان وادب

☆	دو کہانیاں	سردار عرفان	۷۴
☆	چور پر مور	سراج فاروقی	۷۶
☆	پیامی غزل	آثر لکھنوی	۷۷
☆	وقت کا احساس پرندوں اور پودوں میں	محمد ریحان	۷۸
☆	چوہا اور چمگاڈر	فرزانہ اسد	۸۰

سردار عرفان

دو کہانیاں

ریچھ کے بچے

شہر میں دو دوست رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سنار تھا اور ایک بڑھئی۔ دونوں اتنے گہرے دوست تھے کہ ماں جائے بھائی کیا ہوں گے، مگر غریبی کے ہاتھوں بڑے پریشان تھے۔

تنگ آ کر دونوں نے طے کیا کہ کسی اور جگہ جا کر خوب دولت کمائیں۔ یہ سوچ کر وہ سفر پر نکلے اور ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں ایک بہت شاندار مندر تھا اور اس میں جو مورتی رکھی تھی وہ سونے کی تھی۔ سونے کی مورتی دیکھ کر ان دونوں کے منہ میں پانی آ گیا اور یہ اسے حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے۔

آخر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے پجاریوں کا سوانگ بھرا اور لگے مندر میں رات دن پوجا پاٹ کرنے۔ اُن کے گیان دھیان کو دیکھ کر لوگ آپس میں باتیں کرتے کہ دور دیس سے دو برہمن آئے ہیں جو بھگوان کے بڑے بھگت ہیں۔ دھیرے دھیرے مندر کے بڑے پجاری کو بھی ان پر بھروسہ ہو گیا اور اسے جب بھی کہیں جانا ہوتا، وہ اپنی جگہ ان دونوں کو سونپ کر جاتا۔

اس طرح ایک بار جب بڑا پجاری راجا کے یہاں یگیہ کے لئے گیا تو اِن بگلا بھگتوں کو موقع مل گیا اور یہ سونے کی مورتی چرا کر بھاگ نکلے۔ اپنے شہر کے قریب پہنچے تو دونوں نے صلاح کی کہ مورتی کو اِس طرح لے جایا گیا تو خطرہ ہے کہ کوئی دیکھ لے۔ بہتر یہ ہے کہ ابھی اسے چھپا دیں اور بعد میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے گھر لے جائیں تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ یہ طے کر کے انہوں نے ایک درخت کے نیچے گڑھا کھودا اور مورتی اُس میں چھپا دی۔

آدھی رات ہوئی تو سنار اکیلا اُس جگہ پہنچا اور گڑھے میں سے مورتی نکال کر لے آیا اور پھر اس سے پہلے کہ بڑھئی کو اِس بات کا پتہ چلے وہ خود صبح سویرے بڑھئی کے یہاں پہنچا اور اُس سے جھگڑنے لگا کہ تو نے دوستی کا ذرا خیال نہ کیا اور بے ایمانی کی۔ یہ باتیں سن کر بڑھئی کو بڑی حیرت ہوئی۔ سنار کا جھوٹا الزام سن کر وہ سمجھ گیا کہ سنار کے دِل میں بے ایمانی آ گئی ہے۔ وہ بولا:

’’پیارے دوست، اگر تم مورتی میں سے مجھے حصہ نہیں دینا چاہتے تو نہ دو، لیکن مجھ پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔‘‘

سنار خوش خوش چلا گیا، لیکن بڑھئی نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

کچھ دنوں بعد اُس نے سنار کا ایک پتلا بنایا اور اُسے ویسے ہی کپڑے پہنائے جیسے کہ سنار پہنتا تھا۔ اُس کے بعد وہ کہیں سے ریچھ کے دو دو چھوٹے چھوٹے بچے لایا اور انہیں لکڑی کے اس پتلے کے پاس رکھ دیا۔ جب اِن بچوں کے کھانے پینے کا وقت ہوتا تو بڑھئی انہیں اپنے ہاتھ سے نہ دیتا بلکہ سنار کے پتلے کی آستینوں اور دامن میں رکھ دیتا۔ ریچھ کے بچے وہیں سے اپنے کھانے پینے کی چیزیں لے کر پیٹ بھرتے۔ رفتہ رفتہ وہ اس پتلے سے اتنا ہل مل گئے کہ جب بھوک لگتی تو اُسی کے پاس آتے۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی یہی کہتا کہ یہ بچے پتلے کو ہی اپنا ماں باپ سمجھتے ہیں۔

اب ایک دن بڑھئی اپنے دوست سنار کے پاس گیا اور اُسے بیوی بچوں کے ساتھ گھر آنے کی دعوت دی۔ محلے کے اور لوگوں کو بھی بلایا۔ جب سب لوگ مزے لے لے کر کھا پی رہے تھے تو بڑھئی نے سنار کے دونوں بچوں کو اپنے گھر میں چھپا دیا اور اُن کی جگہ ریچھ کے بچوں کو چھوڑ کر چلانے لگا کہ لوگو! دیکھو، غضب ہو گیا۔ میرے مہمان کے بچے ریچھ کے بچے بن گئے۔ سنار یہ سن کر بہت گھبرایا اور لگا بڑھئی کی منت سماجت کرنے، وہ بولا:

’’بھگوان کے لئے اتنا جھوٹ نہ بول۔ بھلا انسان بھی جانور بن سکتا ہے۔ میرے بچے واپس کر!‘‘ لوگوں نے بھی اُس سے ہمدردی کی، لیکن بڑھئی اپنی بات پر اڑا رہا اور بولا:

’’قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ اکثر ہمیں دنیا ہی میں اپنے کرموں کا پھل مل جاتا ہے۔ شاید میرے دوست کے ساتھ بھی

ایسا ہی ہوا ہے۔"

آخر یہ معاملہ فیصلے کے لئے قاضی کے پاس پہنچا۔ قاضی بھی یہ عجیب وغریب داستان سن کر حیران ہوا۔ اس نے ڈانٹ کر بڑھئی سے کہا:

"یہ کیا گڑبڑ مچا رکھی ہے تم نے؟ بھلا انسان کے بچے کبھی ریچھ کے بچے بن سکتے ہیں؟"

بڑھئی نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "حضور والا! میں نے بزرگوں سے سنا تھا کہ کسی زمانے میں خدا کے قہر کا شکار ہو کر ایک بستی کے لوگ بندر بن گئے تھے، لیکن اُن کی عقل اور سوجھ بوجھ انسانوں کی سی ہی رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے دوست سنار کے بچوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔"

قاضی نے کہا: "اس بات پر میں کیسے یقین کروں بھلا؟"

بڑھئی نے جواب دیا: "آپ ریچھ کے بچوں کو سنار کے سامنے لا کر دیکھئے۔ اگر وہ اس کے بچے ہوئے تو اپنے باپ کو ضرور پہچان لیں گے۔"

قاضی کو یہ ترکیب پسند آئی۔ ریچھ کے بچے لائے گئے، انہوں نے جیسے ہی سنار کو دیکھا، لپک کر اس کے پاس آئے اور اس کی آستین اور دامن کو کھینچنے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑھئی نے انہیں کئی دن سے بھوکا رکھا تھا، اس لئے سنار کو دیکھتے ہی وہ اپنا کھانا لینے کے لئے اُس کی طرف لپکے۔ اب تو قاضی اور عدالت میں موجود دوسرے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ بچے سنار ہی کے ہیں۔ قاضی نے یہی فیصلہ کیا اور سنار کو حکم دیا کہ وہ اپنے بچے لے جائے۔

سنار بڑھئی کے قدموں پر گر پڑا اور رو رو کر معافی مانگنے لگا۔ وہ بولا: "میں جانتا ہوں تم مجھے میری غلطی کی سزا دے رہے ہو۔ میں شرمندہ ہوں۔ تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ مجھے میرے بچے لوٹا دو۔"

"بڑھئی کو اُس کا حصہ مل گیا اور سنار کو اُس کے بچے۔"

راز کی بات

ایک سنار اور ایک سپاہی میں گہری دوستی تھی۔ ایک بار سپاہی کہیں سفر پر جا رہا تھا۔ جاتے وقت اُس نے اپنی ایک تھیلی، جس میں کئی سو روپے تھے، اپنے دوست سنار کو لا کر دیا اور کہا:

"میں باہر جا رہا ہوں۔ میرے روپے سنبھال کر رکھنا، جب میں واپس آؤں گا تو لے لوں گا۔"

چند مہینے گزر گئے، سپاہی واپس آیا اور اپنی تھیلی مانگی۔ اس دوران میں سنار کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے سپاہی کو جواب دیا:

"کیسی تھیلی......؟ کیا تم نے مجھ سے اسی لئے دوستی کی تھی کہ مجھے چور بناؤ...... جاؤ میاں اپنا رستہ لو......"

سپاہی بہت گڑگڑایا، لیکن سنار ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر سپاہی روتا دھوتا قاضی کے پاس پہنچا اور سنار کے خلاف فریاد کی۔ قاضی جی نے سنار کو بلوایا اور سمجھایا کہ وہ ایمانداری سے سپاہی کی تھیلی واپس کر دے، لیکن سنار کا جواب وہی تھا: "تھیلی میرے پاس نہیں ہے۔"

قاضی صاحب نے ایک ترکیب سوچی۔ انہوں نے سنار اور اس کی بیوی کو یہ کہہ کر ایک کمرے میں بند کر دیا کہ اس مقدمے کا فیصلہ دوسرے دن کیا جائے گا۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا صندوق رکھا ہوا تھا اور قاضی صاحب نے اس میں اپنے ایک آدمی کو چھپا دیا تھا۔ جب کچھ رات گزری تو سنارنی نے اپنے شوہر سے کہا:

"اگر تم نے تھیلی لی ہے تو کم از کم مجھے تو بتا دو...... ورنہ ہم دونوں کو پریشانی اُٹھانی پڑے گی۔"

پہلے تو سنار چپ رہا، لیکن جب اس کی بیوی نے بہت زور دیا تو اس نے بتایا کہ تھیلی اُس کی چارپائی کے نیچے زمین میں گڑی ہے، لیکن اُس نے اپنی بیوی کو تاکید کی کہ قاضی کے سامنے زبان نہ کھولے۔ قاضی کے فرشتے بھی تھیلی کو تلاش نہیں کر سکیں گے۔

صبح ہوئی تو سنار اور سنارنی کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی کے پوچھنے پر انہوں نے پھر یہی کہا کہ سپاہی نے انہیں کوئی تھیلی دی ہی نہیں تھی۔ اب قاضی صاحب نے صندوق میں چھپے ہوئے آدمی سے پوچھا کہ بتاؤ، اِن دونوں نے رات کو کیا باتیں کی تھیں۔ اُس نے جو کچھ سنا تھا بتا دیا۔

قاضی صاحب نے اپنے آدمی بھیج کر سنار کے گھر سے وہ تھیلی نکلوا لی اور سنار اور اس کی بیوی کو سزا دی۔ (ماخوذ از کتابچہ "سدا بہار کہانیاں" تالیف وتزئین سردار عرفان، مطبوعہ بمبئی، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۴ تا ۲۸ وص ۳۱ وص ۳۲)

سراج فاروقی

703 Wadghar, Panvel-410206, Dist, Raigad,Navi, Mumbai, Panvel-410206
(Mob.8108894969)

چور پر مور

اپریل کی ایک مدھم دوپہری تھی۔

کوئل کی کوک فضا میں ویسے گونج رہی تھی جیسے ساون کی کسی پرانی یاد کو چھیڑ رہی ہو۔ پچھوا ہوا، خزاں رسیدہ رومال کی طرح، نرمی سے ہر سمت لہرا رہی تھی۔ ہواؤں میں خنکی گھلی ہوئی تھی اور آموں سے لدے پیڑوں کی ڈالیوں پر ہریالی کے ساتھ سنہری جھلک بھی چمکنے لگی تھی۔ کچھ آم پک کر جھڑنے لگے تھے، کچھ ابھی کچے تھے، مگر رس سے بھرے ہوئے، جیسے سورج کی دھوپ نے انہیں اپنی گود میں سنبھال رکھا ہو۔

باغ کے ادھر ادھر کچھ بچے گھومتے پھر رہے تھے، کوئی جوڑا بنائے، کوئی تن تنہا، مگر سب کی نظریں درختوں کی چوٹیوں پر جھولتے آموں پر گڑی تھیں۔ قدموں کے نیچے سوکھی پتیاں چرمراتی تھیں، لیکن وہ انہیں پیروں سے ہٹاتے، شاخوں پر ٹنگے آموں کو للچائی نگاہوں سے تکتے جاتے۔ کچھ تو اتنے دل سے آم کو تکتے تھے کہ جیسے نظر ہی سے توڑ لیں گے۔ ان کے منہ میں رال سی بھر آتی اور دل میں ایک ہی تمنا مچلتی:

"کاش کوئی پکا آم جھڑ جائے ...... اور ہم لپک کر لے بھاگیں...... کسی جھاڑی کے پیچھے جا چھپیں اور وہیں بیٹھ کر چوسیں...... اللہ کی قسم، کیا مزا آئے گا؟"

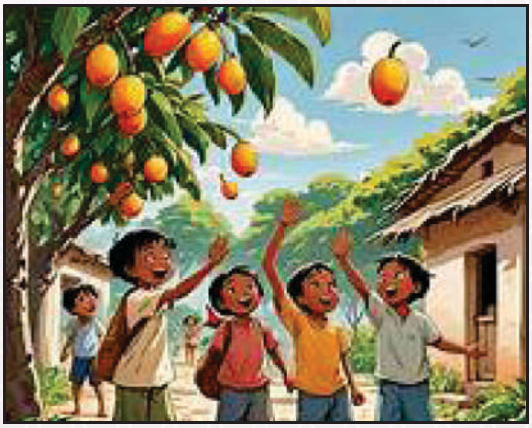

کچھ بچے تو خواب ہی میں آم چوس رہے تھے، مگر وہ جانتے تھے، تصور کی لذت الگ چیز ہے، اصلی آم کی چاشنی الگ۔ تصور سے تو اور بھی بھوک چمکنے لگتی ہے۔ لالچ کا پتنگا دل میں لپکنے لگتا ہے۔

"دھپپ......"

اچانک ایک طرف سے آم گرنے کی آواز آئی، جیسے بادل کی گرج سے پیڑ ہلا ہو۔ سب کے سب بچے اس آواز پر ایسے لپکے جیسے شہد کی بوند پر مکھیاں، جو گروپ میں تھے اور وعدہ کر چکے تھے کہ آم ملا تو برابر بانٹیں گے، وہ بھی اس وعدے کو پیچھے چھوڑ کر ایک دوسرے کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ نکلے۔

کوئی گرا، کوئی ٹھوکر کھا کے سنبھلا، کوئی شاخ سے الجھ گیا، کسی کا پیر پھسل گیا۔ دھول اڑی، چیخ پکار ہوئی۔ یہ منظر شاید اولمپکس کے دوڑ کے مقابلے سے بھی زیادہ زور آور تھا۔

اور آخر کار آم روہن کے ہاتھ لگا۔

بڑا سا، پیلا پیلا، خوشبودار، رسیلا، نرم و گداز ...... جیسے آم نہیں، شہد سے بھرا سورج کا ٹکڑا ہو۔

باقی بچے چھٹپٹا گئے۔ کئی نے چھیننے کی کوشش بھی کی، مگر روہن نے دونوں ہاتھوں سے آم ایسے تھاما جیسے خزانے کا صندوق پکڑ لیا ہو۔ جن بچوں سے وعدہ کیا تھا، انہوں نے وعدہ یاد دلایا تو وہ مکر گیا۔ آنکھیں چرا کر ہنسا اور کندھے اچکا کر بولا:

"وعدہ......؟ کون سا وعدہ......؟"

بچے بپھر گئے۔ کوئی کوسا، کوئی برا بھلا کہنے لگا، مگر روہن کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ آم کو بار بار اچھالتا، دکھاتا اور جیسے کہتا ہو:

"لے دیکھ! چکھ بھی نہیں سکتا تو۔"

سب بچے دور ہو کر کڑھتے رہے۔ کسی نے دانت پیسے، کسی نے مٹھیاں

آثرؔ لکھنوی

پیامی غزل

منزل کا اعتبار بڑھاتے چلے چلو
کانٹے رہِ طلب سے ہٹاتے چلے چلو
ذرّوں کو آفتاب بناتے چلے چلو
دیدہ وری کی شان دکھاتے چلے چلو

ہر منظرِ حیات کو مانند صبح نو
اک پیکر جمیل بناتے چلے چلو
مانا نصیب سوگئے ، بیدار تم تو ہو
سوتے ہوئے نصیب جگاتے چلے چلو

کانٹوں کو روندتے ہوئے ، شعلوں سے کھیلتے
ہر ہر قدم پہ دھوم مچاتے چلے چلو

زُورِ و رِیا کے دام بچھاتے ہیں اور لوگ
تم نیکیوں کے دام بچھاتے چلے چلو
تعمیر عصر نو کی تمہیں میں ہے اہلیت
قول و عمل سے اپنے بتاتے چلے چلو

بجھتے ہوئے چراغ بھی ہیں کام کے آثرؔ
شمعیں نئی انہیں سے جلاتے چلے چلو

(ماہنامہ ’’شاہکار‘‘ الہ آباد، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص۱۲۴ سے ماخوذ)

بھینچیں، کسی نے دل میں بددعا دی: ’’اچھا ہوا، بدتمیز غرور کرتا ہے۔ ایک دن تو ناک رگڑے گا زمین پر۔‘‘

’’چرر...... پرر...... پرر...... مرر......‘‘

اچانک باغ کے کونے سے ایک جوان نکلا۔ تیز قدموں سے آیا۔ رنگ گورا، بدن مضبوط، آنکھوں میں بجلی سی لپک۔ ایک لمحے میں روہن کے پاس پہنچا اور نہایت پھرتی سے آم اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور زوردار آواز میں ڈپٹ کر بولا:

’’توڑا آم......؟‘‘

روہن گھبرا گیا:

’’نہیں...... نہیں، میں نے نہیں۔‘‘

جوان کی آنکھیں شعلہ برسا رہی تھیں، بولا:

’’بھاگ یہاں سے اور آئندہ ادھر جھانکا بھی تو وہ دھول چٹاؤں گا کہ نانی نہیں، نانی کی نانی یاد آجائے گی، سمجھے......‘‘

عمر میں بڑا بھی تھا، قد کاٹھ میں ڈیل ڈول والا بھی اور زبان میں دھمک بھی۔ روہن کی ساری اکڑ نکل گئی۔ جیسے بھیگی بلی بن گیا ہو، نظریں جھکائے پیچھے ہٹا اور دبک کر نکل گیا۔

باقی سب بچے ہنس پڑے، ہنسی بھی وہ جو دل کے اندر سے نکلے:

’’چور کی چوری گئی اور مور کی چال بھی گئی۔‘‘

ایک نے کہا: ’’لے اب کھا آم، کمبخت! غرور کا سر جھک ہی گیا آخر!‘‘

روہن کی آنکھوں یں آنسو بھر آئے۔ دل میں چبھتا ہوا سا دکھ تھا، ہونٹ کانپنے لگے اور وہ سسکتا ہوا۔ ’’اماں...... اماں......‘‘ پکارتا وہاں سے نکل گیا۔ ❁❁

محمد ریحان
Sabzibagh, Patna - 800004

وقت کا احساس پرندوں اور پودوں میں

وقت کی اہمیت ساری دنیا جانتی ہے اور جب سے یہ دنیا بنی ہے، ہر دور کا انسان ایک دوسرے کو یہ بتا تا آرہا ہے کہ وقت کی قدر کرو، زندگی کی کامیابی اسی میں ہے کہ اس انمول دولت کو برباد نہ ہونے دیا جائے، لیکن سوال یہ ہے کہ وقت کی ناقدری کا سلسلہ جانے یا اَنجانے میں کل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کی قدر کرنے کا معاملہ وقت کے احساس سے جڑا ہوا ہے، اس لئے جب جب ہمارا یہ احساس کمزور ہونے لگتا ہے، تب تب وقت کی ناقدری عام ہونے لگتی ہے، حالاں کہ ذرا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ قدرت نے صرف ہم انسانوں کو نہیں، بلکہ اس دنیا کی ساری مخلوقات کو جہاں وقت جیسی نعمت دی ہے، وہیں اُس کا احساس بھی بخشا ہے تا کہ اِس نعمت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ آدمی تو آدمی ٹھہرا، جانوروں، پرندوں اور

پرندوں کا جھنڈ

انڈوں کو سیتی مرغیاں

مگرمچھ اور انڈے

ساحلی چڑیاں

پودوں کو بھی قدرت نے وقت کا احساس دیا ہے اور وہ اپنی دنیا میں اس سے خوب خوب کام لیتے ہیں۔

ذرا یہ سوچئے تو حیرت ہوگی کہ ہمارے پاس وقت بتانے والی اچھی سے اچھی طرح طرح کی گھڑیاں ہیں، لیکن پھر بھی ہم وقت کا پورا اور صحیح مصرف نہیں لے پاتے اور نہ جانے کتنے ہی کام ہیں جو وقت پر چھوٹ جاتے ہیں، جب کہ جانوروں، پرندوں اور پودوں کے پاس نہ وقت بتانے والے آلات ہوتے ہیں، نہ کسی قسم کی گھڑی ہوتی ہے، مگر وہ اپنا کام وقت کے مطابق کرتے رہتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں وقت کا جو احساس قدرت کی طرف سے ملا ہے، اُسے وہ کبھی کمزور نہیں ہونے دیتے۔

ہم اکثر اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ دور دراز علاقوں اور ملکوں سے خاص خاص موسم میں، پرندوں کا جھنڈ کا جھنڈ بھارت کے کسی خاص علاقے میں آتا ہے اور پھر مہمان پرندوں کا یہ جھنڈ، کچھ خاص وقت گزار کر اپنے وطن لوٹ جاتا ہے۔ اس سے بیشک یہی ثابت ہوتا ہے کہ پرندوں میں وقت کا احساس موجود ہے۔ صبح سویرے جب مرغ بانگ دیتا ہے، چڑیا چہچہاتی ہے، تب بھی ہمیں اس بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان میں وقت کا صحیح احساس موجود ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مرغیاں انڈے دینے کے بعد روزانہ انہیں سیتی ہیں یعنی خاص خاص وقت تک انڈوں پر بیٹھ کر انہیں گرمی پہنچاتی ہیں، یہاں تک کہ ۲۱ دن بعد بچے نکل آتے ہیں اور تب وہ انہیں اپنے پروں میں چھپا لیتی ہیں۔ شام کا جھٹپٹا ہوتا ہے تو پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹنے لگتے ہیں اور جب پو پھوٹتی ہے تو رزق کی تلاش میں اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل آتے ہیں۔ اِن باتوں سے یہی ثبوت ملتا ہے کہ قدرت نے انہیں وقت کا احساس دیا ہے اور بہر حال وہ وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔

مگر مچھ کو ہم پرندہ نہیں کہہ سکتے، وہ پانی کا جانور ہے، مگر

شہد کی مکھیاں

چمگادڑ

اونگھتا ہوا اُلو

اُڑان بھرتے پرندے

اس میں بھی وقت کا احساس ہے، اس کی مادہ، جب خاص وقت آتا ہے تو دریا کے کنارے آتی ہے، مٹی کھودتی ہے، انڈے دیتی ہے اور انہیں دوبارہ مٹی سے ڈھانک کر چلی جاتی ہے، پھر تین ماہ بعد وہ اسی جگہ آتی ہے اور وہاں سے اپنے بچوں کو لے جاتی ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پاس وقت کا احساس ہے اور جگہ کی پہچان بھی۔

سمندر میں جوار بھاٹا اُٹھتا ہے تو بہت سے کیکڑے، سیپی، گھونگھے، جھینگے اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کنارے پر آجاتی ہیں، پھر جوار کی وہ بڑی لہر تو لوٹ جاتی ہے، مگر وہ چیزیں وہیں پڑی رہ جاتی ہیں اور پھر ساحلی چڑیوں کے اندر وقت کا احساس دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ آتی ہیں اور ان پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ انہیں اس طرح دعوت اُڑانے کا موقع اسی لئے مل پاتا ہے کہ وہ وقت کا احساس رکھتی ہیں اور ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کے لئے گویا خوان نعمت بچھا ہوتا ہے۔

قطب شمالی اور قطب جنوبی کے بہت سارے پرندے نقل مکانی کیا کرتے ہیں جو اُن کے اندر وقت کے احساس کا ثبوت ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ امریکہ میں سمندر کے مغربی کنارے اور مشرقی کنارے پر وقت کا فرق یہ ہے کہ مغرب میں دن کے دس بجتے ہیں تو مشرق میں دوپہر کا ایک بجتا ہے۔ ایک مرتبہ مشرقی کنارے پر رہنے والی شہد کی مکھیوں کے غول کو جہاز سے مغربی کنارے پر لے جایا گیا، مگر وہاں پہنچ کر وہ دس بجے اپنے چھتے سے یوں نکل پڑیں جیسے ان کی گھڑی نے ایک بجادئے ہوں۔ یہ اصل میں وقت کا فطری احساس تھا۔

یہ تو دور کی باتیں ہیں، ہم سبھی جانتے ہیں کہ چمگادڑ دن کو نہیں نکلتی ہے اور اُلو دن بھر سوتا ہے، یہ بہر حال وقت ہی کا احساس ہے۔

پرندوں کی مثالیں جانے دیں، پودوں کی طرف بھی دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان میں بھی وقت کا کتنا احساس ہے۔ مثلاً ''دس بجیا'' پھول (آفس فلاور) جانتا ہے کہ اُسے آفس کے وقت دس بجے کھلنا ہے۔ اسی طرح ''گل دوپہری'' کو معلوم ہے کہ اب دوپہر ہوگئی اور اس کی ٹہنیوں پر لال لال پھول کھل جاتے ہیں۔ ''رات کی رانی'' بھی دن اور رات کا فرق جانتی ہے اور جب رات آتی ہے، تب ہی اپنی بہاریں دکھاتی ہے۔ ''گل داؤدی'' کو دن کے چھوٹے ہوجانے کا پتہ ہوتا ہے اور جب جاڑے کا موسم آتا ہے تو وہ پھول دینے لگتا ہے۔ ''سورج مکھی'' کو بھی وقت کا احساس ہے کہ کب سورج طلوع ہوا، کب دوپہر ہوئی اور کب سورج ڈوب گیا۔

پرندوں اور پودوں میں وقت کے احساس کی یہ چند مثالیں ہیں۔ قدرت نے انہیں یہ نعمت دی ہے اور اس سے وہ کام لیتے ہیں۔ یہ سب جاندار ہیں جانداروں میں سب سے افضل انسان ہے تو پھر اُسے یہ دولت کیوں نہیں ملتی، بیشک ہمیں یہ دولت دوسرے جانداروں سے کہیں زیادہ ملی ہے اور ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی زندگی اور اپنے سماج میں وقت کا احساس ہمیشہ مضبوط اور تروتازہ رکھیں اور کبھی وقت کی بربادی اور ناقدری نہ کریں۔ (ماہنامہ ''قومی راج'' بمبئی خصوصی شمارہ نومبر ۱۹۸۶ء سے اخذ واستفادہ کے ساتھ) ❀❀

دس بجیا پھول

گل دوپہری

رات کی رانی

گل داؤدی

سورج مکھی

فرزانہ اسد
30, Gulistan Colony, Near Panda Amrai Lawns,
Nagpur - 440013 (Mob. 9579591149)

چوہا اور چمگادڑ

کسی جنگل میں ایک چوہا جھاڑیوں میں رہتا تھا۔اس کا نام اویت تھا۔اسی جنگل میں ایمنگ نامی ایک چمگادڑ بھی رہا کرتی تھی۔ دونوں دوست تھے۔دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے، ساتھ کھاتے اور کھیلتے۔ دوست ہونے کے باوجود چمگادڑ کا دل چوہے کی طرف سے صاف نہیں تھا۔نہ جانے کیوں وہ اس سے جلتی تھی۔وہ انتظار میں تھی کہ کب موقع ملے اور وہ چوہے کو نقصان پہنچائے۔ایک دن چوہے نے چمگادڑ کے کھانے کی بہت تعریف کی اور کہا:

''تم اس قدر لذیذ سوپ کیسے بنا لیتی ہو؟''

''ایسا لذیذ سوپ یوں ہی نہیں بن جاتا، میں اس سوپ میں خود کو ابالتی ہوں۔''

''اچھا؟'' چوہے کا منھ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''اس کی ترکیب مجھے بھی بتاؤ نا۔ میں بھی سوپ بناؤں گا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، آؤ میں تمہیں سوپ بنا کر بتاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر چمگادڑ کچن میں گئی اور ایک برتن نکال لائی، اس میں گرم پانی تھا۔پانی زیادہ گرم نہ تھا، مگر اس نے چوہے کو بتایا کہ اس میں اُبلتا ہوا پانی ہے۔اس کے بعد چمگادڑ نے اس پانی میں چھلانگ لگا دی۔ چند غوطے لگانے کے بعد وہ باہر نکل آئی۔پھر وہ سوپ چوہے کو پیش کر دیا۔ چوہے نے سوپ پیا تو اس میں وہی مزہ تھا جو اس سے پہلے چمگادڑ کے بنائے سوپ میں ہوا کرتا تھا۔

اس کے بعد چوہا اپنے گھر گیا۔اس نے چوہیا کو بتایا کہ وہ چمگادڑ سے سوپ بنانے کی ترکیب سیکھ کر آیا ہے اور اب وہ سوپ بنائے گا۔ اس نے چوہیا سے کہا کہ اسے ایک برتن میں اُبلتا ہوا پانی لا کر دے۔ چوہیا نے ایک برتن میں اُبلتا ہوا پانی لا کر دے دیا اور کسی کام سے ذرا دیر کے لیے گھر سے باہر چلی گئی۔

اس دوران چوہے نے اس اُبلتے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دی اور وہی ہوا جو ہونا تھا۔تھوڑی دیر بعد چوہا مر گیا۔جب چوہیا گھر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ چوہا ابلے ہوئے پانی میں مرا پڑا ہے۔

وہ بہت روئی چلائی اور غصے سے آگ بگولہ ہو گئی۔پھر وہ جنگل کے راجہ کے پاس گئی اور چمگادڑ کی کرتوت اسے سنائی۔

چوہیا کی بات سن کر بادشاہ کو بہت دکھ ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اسے افسوس ہوا کہ چمگادڑ نے جھوٹ بول کر دھوکہ دیا۔اس کی حکومت میں ایسی وارداتیں ہونے لگیں تو لوگوں کا جینا مشکل ہو جائے گا، اسے روکنا ہوگا، یہ سوچ کر راجہ نے حکم دیا کہ چمگادڑ کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔

لوگ چمگادڑ کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے۔جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا مگر چمگادڑ گرفتاری کی بھنک لگتے ہی جھاڑیوں میں چھپ گئی تھی۔لوگ اسے دن بھر ڈھونڈتے رہے۔آخر تھک ہار کر یہ کہہ کر گھر واپس چلے گئے کہ ہم سے بچ کر کہاں جائے گی، کل دن نکلتے ہی اسے پھر تلاش کریں گے۔

چمگادڑ کو اندازہ تھا کہ اتنے سارے لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہیں تو اس کی جان خطرے میں ہے۔وہ کبھی نہ کبھی پکڑی ضرور جائے گی۔ اس نے سوچا اس گرفتاری سے بچنے کے لیے مجھے اب اپنی عادت بدلنی پڑے گی۔اب میں یہ کر سکتی ہوں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بجائے دن کے رات میں باہر نکلوں جب ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے، اس طرح کوئی مجھے دیکھ بھی نہیں پائے گا، چنانچہ اس دن کے بعد اس نے ویسا ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے آپ کو چمگادڑ دن میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔(نائجیریا کی لوک کہانی کا ترجمہ) ❁❁

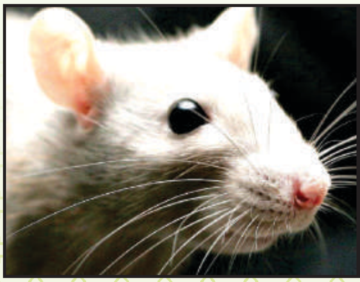

حیرؔت فرخ آبادی

حیرؔت فرخ آبادی کا اصل نام جیوتی پرساد مصر تھا، لیکن وہ شاعری کی دنیا میں حیرؔت فرخ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کے والد کا نام متھرا پرساد مصر تھا جو مشنری اسکول فرخ آباد میں دینیات پڑھاتے تھے، انہیں نوزبانوں پر مہارت حاصل تھی اور شاعری میں ان کا تخلص نامؔی تھا۔ حیرؔت کے نانا امیٹھی کے ایک پٹھان خانوادے سے تھے جنہوں نے پورے خاندان کے ساتھ عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا۔ حیرؔت اپنے والدین کی چھٹی اولاد تھے۔ وہ ۸؍فروری ۱۹۳۰ء کو بہرائچ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ جولائی ۱۹۲۱ء کو رانچی میں ان کا انتقال ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حیرؔت نے کرشچن ہائی اسکول فرخ آباد کے علاوہ گورکھپور اور لکھنؤ کے کالجوں میں پڑھا اور حصول تعلیم کے بعد ''وکاس ودیالیہ'' رانچی میں ۱۹۶۰ء سے بحیثیت معلم اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ۱۹۹۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ مجنوؔں گورکھپوری کی سرپرستی میں شاعری کی شروعات کرنے والے حیرؔت فرخ آبادی کی پہلی نظم ''ایک غریب طالب علم'' ۱۹۴۵ء کی یادگار ہے۔ حیرؔت کا شعری مجموعہ ''نوائے ساز دل'' ۱۹۸۸ء میں اور ''حسن التماس'' ۲۰۰۸ء میں چھپ چکا ہے اور ان کا ہندی مجموعہ کلام ''کریدے گھاؤ من کے'' بھی اشاعت یافتہ ہے۔

اشعارِ حیرؔت

یہ کہانی ، یہ فسانہ بس اسی شب بھر کا ہے   زندگی شیشے کی ہے اور آدمی پتھر کا ہے
نا امیدی ، بے یقینی ، بے بسی ، بے چارگی   ایک تیرا ہی نہیں ، یہ قصہ اب گھر گھر کا ہے

چار سو نفرتوں کی ہے بارش   زخم دل کا ہرا سا رہتا ہے
کس طرف جائے یہ سڑک جانے   بس یہ کھٹکا لگا سا رہتا ہے

وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے اندازِ سخن   شاعر آزاد ہے ، لہجے کئی اظہار کے ہیں
ہم کو حیرؔت نہ ہوس ہے کوئی مال و زر کی   ہم کسی چیز کے بھوکے نہیں بس پیار کے ہیں

یورشیں جھیلتا ہے موسم کی   مدتوں بعد پیڑ پھلتا ہے
چلنا پڑتا ہے وقت کے ہمراہ   وقت کب کس کے ساتھ چلتا ہے

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 46 **July 2025** **No. 07**

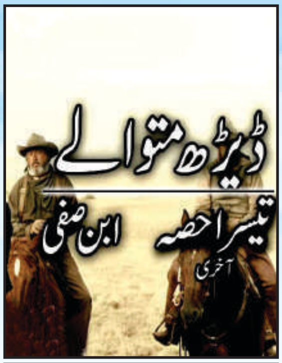

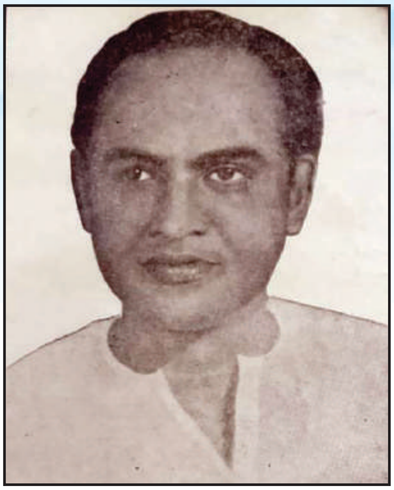

ایڈیٹر، پبلشر **ابراراحمد خان**، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کراکے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

₹ 15/-